سفرنامہ جنوب مشرقی ایشیا

سفرنامہ جنوب مشرقی ایشیا

سفر اور سقر

اردو زبان کے کلاسیکی دور میں ایک مصنف مرزا رجب علی بیگ سرور گزرے ہیں۔ وہ مشکل الفاظ سے آراستہ اور نظم کے انداز میں نثر لکھنے کے لیے مشہور تھے۔ انھوں نے کہیں لکھا تھا کہ سفر اور سقر (جہنم) کی صورت ایک ہے، ان سے بچنا نیک ہے۔ ان کا یہ جملہ زمانۂ قدیم کی ان مشکلات کا بہت خوبصورت بیان ہے جو دورانِ سفر لوگوں کو پیش آیا کرتی تھیں۔ مشینی دور سے قبل سفر کا مطلب بے وطنی کا وہ طویل وقفہ تھا جو ہر طرح کی مشکلات اور خطرات سے پر ہوتا تھا۔ دورِ جدید میں سفر بہت آرام دہ ہو چکا ہے، مگر کچھ لوگوں کے لیے آج بھی یہ ایک مشکل کام ہے۔ میرا شمار ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔ لیکن لگتا ہے کہ میرے ہاتھ میں سفر کی لکیر شاید عام لوگوں سے زیادہ طویل ہے۔ اس لیے بار بار مجھے سفر کے مواقع پیش آجاتے ہیں۔

مئی 2008 میں مجھے جنوب مشرقی ایشیا کے تین ممالک سنگاپور، ملائیشیا اور تھائی لینڈ جانے کا موقع ملا۔ سفر ذاتی نوعیت کا تھا اس لیے اس کی روداد لکھنے کا کوئی جواز میرے پاس نہ تھا۔ لیکن سفر مجھے جس وجہ سے ناپسند ہے وہی وجہ قلم اٹھانے کا سبب بھی بنی ہے۔ مجھے معمول کی زندگی گزارنا پسند ہے۔ جبکہ سفر میں عام روٹین کی لائف اور معاملات درہم برہم ہوجاتے ہیں۔ لیکن یہ قیمت دینے کے بعد سفر کے نتیجے میں انسان ایک نئی دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ اس دنیا میں پہنچ کر شعور کی وہ آنکھ کھل جاتی ہے جو معمول کی زندگی میں کم ہی بیدار رہتی ہے۔ یہ آنکھ انسانی ذہن کے

معاملات کو دیکھنے کا ایک نیا انداز دیتی ہے، حقائق اور تصورات کے درمیان تفریق سکھاتی ہے، مسائل کے ادراک اور حل کا ایک نیا زاویہ دیتی ہے، دو چیزوں کے درمیان فرق کرنا سکھاتی ہے اور سب سے بڑھ کر اگر ایمان کی روشنی حاصل ہے تو معرفت کی اُس منزل تک پہنچا دیتی جو ایک مؤمن کے لیے سرمایۂ حیات ہوتا ہے۔ سفر کے یہی روحانی اور اس کے علاوہ یقیناً بہت سے مادی فوائد بھی ہیں جن کی بنا پر سفر کو وسیلۂ ظفر بھی کہا گیا ہے۔

خوشی اور معرفت

میں روانہ ہونے لگا تو دوست احباب میں سے ہر شخص نے خوشیوں کی دعا دی۔ وہاں پہنچ کر بھی یہ لوگ رابطے میں رہے اور یہی دعا دہراتے رہے۔ مگر میں نے پروردگار سے مستقل یہ دعا کی مجھے معرفت ملے۔ خوشیوں سے کس کافر کو انکار ہوسکتا ہے؟ مگر جس خوشی کے پیچھے معرفت نہ ہو وہ اکثر دل کی سختی کا سبب بن جاتی ہے۔ انسان پر غفلت چھا جاتی ہے۔ اسے معلوم بھی نہیں ہوتا اور وہ پروردگار کی حضوری سے نکل جاتا ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے خوشی کی اس حیثیت کو جگہ جگہ اپنے نافرمانوں کے ذکر میں بیان کیا ہے۔ وہاں اگر خوشی مثبت انداز میں بیان ہوئی ہے تو جنت کی کامیابی کے ضمن میں یا اس دنیا میں قرآن پاک کی عظیم نعمت کے حوالے سے جو دراصل سارے حقائق اور معرفت کا بنیادی سرچشمہ ہے۔

خوشی ویسے بھی اپنی ذات میں کسی چیز کا نام نہیں۔ یہ ہمیشہ کسی دوسری چیز کے پانے کا ایک نتیجہ ہوتی ہے۔ اور اس دنیا میں تو انسان جو پائے گا وہ بہت جلد کھو دے گا۔ اس لیے یہاں کی ہر خوشی عارضی اور ہر لذت فانی ہے۔ اصل خوشی کی جگہ تو آگے آرہی ہے۔ جہاں ہمیشہ اور ہر لمحہ رب کی عنایت کو ایک نئی شان کے ساتھ پانا ہوگا۔ جہاں کا ہر ایک لمحہ، ہر ایک منظر، ہر ایک محفل اور ہر ایک محمل خوشیوں، لذت اور سکون کا وہ خزانہ انسان کو عطا کرے گا کہ

انسان اس دنیا کی ہر تکلیف، ہر دکھ اور ہر محرومی کو بھول جائے گا۔

مشاہداتِ سفر

میں اس سفر کی روداد تو خیر یہاں بیان نہیں کروں گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میرا یہ سفر بالکل ذاتی نوعیت کا تھا، مگر جیسا کہ اوپر میں نے عرض کیا کہ حالتِ سفر میں شعور کی آنکھ خود بخود بیدار ہو جاتی ہے۔ جس کے بعد نہ ذہن کو روکنا ممکن ہوتا ہے اور نہ قلم کو۔ میں چاہوں تو اپنی ذات کے لیے کچھ لکھ کر اپنے پاس رکھ کر یہ مشاہدات محفوظ کرلوں لیکن میری زندگی کا مقصد اپنے رب کی ذات وصفات سے انسانوں کو متعارف کرانا ہے۔ نیز مجھے اپنی قوم کی تعمیر و ترقی سے بڑی دلچسپی ہے۔ اس لیے میں کم از کم ان دو حوالوں سے لکھی گئی چیزوں کو اپنے رسالے کے قارئین تک ضرور پہنچانا چاہتا ہوں۔ اور اس لیے بھی کہ میں جانتا ہوں کہ قارئین کی ایک بڑی تعداد ہے جن کے لیے میں گھر کا ایک فرد ہوں۔ ان سے یہ سب شئیر نہ کرنا شاید ان کے ساتھ زیادتی ہوگی۔

ائیر پورٹ کا محشر

ہوائی سفر کا پہلا مرحلہ ائیر پورٹ ہوتا ہے۔ ائیر پورٹ مجھے ہمیشہ حشر کے میدان کی یاد دلاتا ہے۔ حشر اس مختصر اور فانی دنیا کے بعد شروع ہونے والی اصلی اور ابدی زندگی کا پہلا مرحلہ ہوگا۔ صور پھونکا جائے گا۔ لوگوں کو جمع کیا جائے گا۔ اعمال کا جائزہ لیا جائے گا۔ اور پھر لوگوں کے اعمال کے مطابق ان کے لیے جنت یا جہنم کا فیصلہ کر دیا جائے گا۔ ائیر پورٹ بھی کچھ ایسی ہی جگہ ہے۔ یہاں کسٹم پر سامان چیک ہوتا ہے، وہاں بھی کسٹم پر اعمال چیک ہوں گے۔ یہاں کی سیکیورٹی پر جامہ تلاشی ہوتی ہے، وہاں کی سیکیورٹی پر اخلاقی وجود کی جامہ تلاشی ہوگی۔ یہاں کاؤنٹر پر سامان کا وزن کر کے سیٹ دی جاتی ہے، وہاں میزان پر اعمال کا وزن کیا جائے گا اور جنت یا جہنم میں مقام کا فیصلہ کیا جائے گا۔ یہاں امیگریشن پر پاسپورٹ اور ویزا چیک ہوتا ہے اور وہاں حساب کتاب میں ایمان

کا پاسپورٹ اور اخلاق کا ویزا چیک کیا جائے گا۔

میں امیگریشن کی لائن میں کھڑا یہ سب کچھ سوچ ہی رہا تھا اور ساتھ میں قرآنِ کریم کی یہ آیت پڑھ رہا تھا: رَبَّنَـا إِنَّكَ جَـامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيهِ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ، کہ اچانک میری اہلیہ نے مجھ سے پوچھا: آپ کیا سوچ رہے ہیں؟ میں جس کیفیت میں تھا، اِس میں اُن کی بات کا کوئی جواب نہ دے سکا لیکن میرے دل نے کہا کہ میں اس وقت جو سوچ رہا ہوں وہ ہو کر رہے گا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں وہ نہ جانے کتنے لوگ دیکھتے ہوں گے لیکن جو کچھ میں سوچ رہا ہوں وہ کم ہی لوگ سوچ پاتے ہوں گے۔ یہ سوچ مجھ میں میرے اساتذہ سے آئی ہے۔ لیکن اس سوچ کا حقیقی مأخذ قرآن مجید ہے جو اہل ایمان کو دعوت دیتا ہے کہ وہ انفس و آفاق کی نشانیوں میں گم ہونے اور مشاہدات میں کھو جانے کے بجائے انہیں اپنے روح کی غذا بنائیں اور ان کے ذریعے اپنے ایمان میں اضافہ کریں۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں قرآنِ مجید کا مصرف اب بس یہی رہ گیا ہے کہ بلا سمجھے پڑھ کر مردے بخشوائے جائیں اور دلہنوں کو اس کے سائے میں رخصت کیا جائے۔ اس رویے کے بعد کون قرآنِ مجید کو سمجھ کر پڑھے گا اور کون اس کی بنیاد پر غور و فکر کو اپنی عادت بنائے گا!

دورِ جدید کے دو پہلو

ہماری فلائٹ ساڑھے گیارہ بجے شب روانہ ہوئی۔ پانچ گھنٹے بعد ہم بنکاک کے ائیر پورٹ پر اترے جہاں سے دو گھنٹے بعد ہمیں سنگاپور کے لیے اگلی فلائٹ لینی تھی۔ فجر کی نماز ادا کرنے کے لیے ہم نے کوئی جگہ تلاش کرنا چاہی تو وہاں ایک بہت اچھی مسجد مل گئی۔ ائیر پورٹ کے اندر بنی ہوئی اتنی بہتر مسجد میں نے کسی اور ائیر پورٹ پر نہیں دیکھی۔ واپسی پر اسی ائیر پورٹ کے اندر بنی ہوئی ایک اور مسجد میں نمازِ مغرب ادا کی۔ اس مسجد میں مرد اور خواتین کے لیے نماز کی الگ الگ جگہ کے ساتھ الگ الگ وضو خانے بھی بنے ہوئے تھے۔ اس مسجد کے باہر مجھے ایک عجیب تجربہ ہوا جس

سے دورِ جدید کے دو پہلو مجھ پر واضح ہوئے۔

میں اور میری اہلیہ نماز کے بعد مسجد سے باہر آئے تو دیکھا کہ ایک خاتون مسجد کے شیشوں سے جھانک کر اندر دیکھ رہی ہیں۔ مجھے یہ خیال ہوا کہ شاید ان خاتون کو کوئی غلطی لگی ہے اور یہ اس جگہ کو ڈیوٹی فری لاؤنج کا کوئی دفتر یا دکان سمجھ رہی ہیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ یہ مسلمانوں کی عبادت کی جگہ ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں دراصل اپنے شوہر کو تلاش کر رہی ہوں جو نماز پڑھنے مسجد میں گئے ہیں۔

ان کا یہ جواب میرے لیے قطعاً غیر متوقع تھا۔ کیونکہ وہ اپنے حلیے اور وضع قطع سے کوئی مسلمان خاتون نہیں لگ رہی تھیں۔ یہ تو مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ عربی ہیں، لیکن ہر عربی مسلمان نہیں ہوتا۔ میں زیادہ سے زیادہ یہ حسنِ ظن کر سکا کہ وہ کسی مسلمان کی غیر مسلم بیوی ہیں۔ تاہم وہ اگر مسلمان تھیں تو اپنے دین کا کوئی اچھا تعارف نہیں کرا رہی تھیں اور اگر غیر مسلم تھیں تو اپنے شوہر کے دینی ذوق کا کوئی اچھا تعارف نہ تھیں۔

آزادی دورِ جدید کی بنیادی قدر ہے۔ اس کا مثبت پہلو یہ ہے کہ مذہبی آزادی عام ہوگئی ہے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ جس ملک میں لوگ خدا کو نہیں مانتے وہاں خدا کی عبادت کے لیے مسجد موجود ہے۔ مگر آزادی کا ایک دوسرا نتیجہ عریانی ہے۔ میڈیا نے اس کو فروغ دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور خواتین اس کا سب سے زیادہ نشانہ بنی ہیں۔ خوبصورت نظر آنا خواتین کی کمزوری ہے اور میڈیا کے زیرِ اثر وہ اس مقصد کے لیے بلا تکلف عریانی کا سہارا لیتی ہیں۔ دوسری طرف مردوں پر اس کے اثرات یہ ہوئے ہیں کہ وہ حدِ اعتدال سے زیادہ حسن پرست ہوگئے ہیں۔ شادی کرتے وقت ان کا معیار صرف یہ رہ گیا ہے کہ عورت خوبصورت ہو۔ عورت کا دین اور اس کی سیرت بڑی حد تک غیر متعلق باتیں ہوگئی ہیں۔ اس رویے کا لازمی نتیجہ نئی نسلوں کی بدترین تربیت ہے۔ یہ وہ چیز ہے جسے ہم بھگت رہے ہیں۔

ہمارے سفر کا نقشہ

ہم دو گھنٹوں میں پورا ملائیشیا عبور کر کے سنگاپور پہنچے۔ آگے بڑھنے سے قبل یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سفر کے دائرے میں آنے والے تینوں ممالک کا جغرافیہ واضح کر دیا جائے۔

سنگاپور، ملائیشیا اور تھائی لینڈ دنیا کے جس خطے میں واقع ہیں اسے ساؤتھ ایسٹ ایشیا کہتے ہیں یعنی جنوب مشرقی ایشیا۔ پاکستان سے جنوب مشرق کی سمت آگے بڑھنے پر پہلے ہندوستان اور پھر بنگلہ دیش اور میانمار (برما) آتے ہیں۔ برما جس خطے میں واقع ہے وہ ایک جزیرہ نما (Peninsula) ہے یعنی خشکی کا ایک ایسا حصہ ہے جس کے تین اطراف پانی ہے۔ اس خطے میں برما کے علاوہ لاؤس، ویتنام، کمبوڈیا اور تھائی لینڈ واقع ہیں۔ اس خطے کے مشرق اور مغرب کی طرح جنوب میں بھی سمندر ہے، مگر تھائی لینڈ سے خشکی ایک پٹی کی شکل میں مزید جنوب کی سمت سمندر میں آگے بڑھتی ہے۔ یہ پٹی آگے چل کر قدرے چوڑی ہو جاتی ہے اور پھر بتدریج پتلی ہونے لگتی ہے۔ خشکی کی یہ چوڑی پٹی جس کے تین طرف سمندر اور ایک طرف تھائی لینڈ ہے، ملائیشیا کا مرکزی حصہ ہے جسے جزیرۂ نما ملائیشیا (Peninsular Malaysia) کہتے ہیں۔ اس پٹی کی نوک پر چھوٹا سا سنگاپور واقع ہے۔ گویا اس چوڑی پٹی کے ایک طرف تھائی لینڈ ہے جو ایشیا سے متصل ہے اور دوسری سمت سنگاپور ہے جس سے آگے سمندر اور سمندر کے بعد جزیروں کی شکل میں ملائیشیا کا بقیہ حصہ اور انڈونیشیا آتے ہیں۔

وقت کا خزانہ

سنگاپور پہنچ کر مجھے یہ احساس ہوا کہ ہم چند گھنٹوں کے اندر تقریباً پانچ ہزار کلومیٹر کا سفر طے کر کے ایک نئی دنیا میں پہنچ گئے۔ یہ واقعہ بتاتا ہے کہ وقت کتنی بڑی نعمت ہے۔ اس کو درست استعمال کر کے انسان کیا کچھ حاصل کر سکتا ہے۔ انسان کے لیے تو بلاشبہ وقت ہی سب کچھ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اسے جو مہلتِ عمر دی ہے وہ پچاس ساٹھ سال سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ بہت کم وقت ہے۔لیکن انسان کے پاس یہ مواقع موجود ہیں کہ اس وقت کو صراطِ مستقیم پر چل کر گزارے تو قیامت کے بعد قائم ہونے والی دنیا میں وہ عظیم مقامات حاصل کرسکتا ہے۔ وہ اس مختصر وقت میں ایسے اعمال تخلیق کرسکتا ہے جو نتائج واثرات کے اعتبار سے کبھی نہ ختم ہوں۔

اپنے وقت کا درست استعمال انسان کو کیسی عظیم بادشاہی سے نواز سکتا ہے اس کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ سورج زمین سے تقریباً نو کروڑ میل دور ہے۔ جبکہ سورج سے قریب ترین ستارہ Proxima Centauri تقریباً 252 کھرب میل دور ہے۔ یہ وہ فاصلہ ہے جو روشنی 186282 میل فی سیکنڈ کی رفتار سے سوا چار برس میں طے کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے بعید نہیں کہ وہ بندۂ مؤمن کے اُن لمحات کا بدلہ جو اِس نے نیک اعمال میں گزارے اس طرح عطا فرمائے کہ ہر ہر لمحے میں کیے گئے عملِ صالح کے عوض وہ اسے ایک ستارے کی بادشاہی انعام میں عطا کریں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ بندۂ مؤمن ایک ایک لمحے میں کوئی ایسا عمل کرسکتا ہے جو اسے 252 کھرب میل دور واقع ستارے کی بادشاہی عطا دلا دے۔ آج یہ ستارے بظاہر آگ کے گولے نظر آتے ہیں، مگر اللہ تعالیٰ کی رحمت سے بعید نہیں کہ وہ ان ستاروں کو آنے والی زندگی میں سرسبز وشاداب باغات بنادیں اور پھر انعام کے طور پر اپنے صالح بندوں کو عطا کردیں۔

جدید فلکیات کی ترقی نے یہ بات واضح طور پر بتادی ہے کہ دنیا کے تمام انسانوں کی زندگیوں کو ملا کر اُن کے مجموعی لمحات گنے جائیں تو جتنے لمحات بنیں گے، کائنات میں موجود ستاروں کی تعداد اُس سے کہیں زیادہ ہے۔ اس دنیا میں آج کے دن تک پیدا ہونے والے لوگوں کی تعداد کا غیر حتمی اندازہ تقریباً سو ارب کے لگ بھگ ہے۔ ہر انسان کی اوسط عمر 63

تصور کرلی جائے تو ایک انسان کی زندگی میں کل دو ارب لمحات آتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اولین سے آخرین تک آنے والے کل انسانوں کی تعداد یعنی سو ارب کی زندگی کے کل لمحات کو اگر لکھنا ہو تو اس طرح لکھیں گے:

200,000,000,000,000,000,000

مجھے نہیں معلوم کے اردو میں اس عدد کو کیسے بیان کریں گے لیکن یہ عدد 2 کے آگے 20 دفعہ صفر لگا کر لکھا گیا ہے۔ قارئین کو یہ تعداد شاید بہت زیادہ لگے لیکن حقیقت یہ ہے کہ کائنات میں ستاروں کی کل تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے۔ سائنسدانوں کے مطابق ستاروں کی جو تعداد ابھی تک دیکھی گئی ہے اسے بیان کرنا ہو تو 7 کے آگے 22 دفعہ صفر لگانا ہوگا۔ یعنی ہر انسان کی ہر سانس کے مقابلے میں ستارے 700 گنا زیادہ ہیں۔ یاد رہے کہ ستاروں کی اصل تعداد نہ صرف اس سے کہیں زیادہ ہے بلکہ مزید ستارے ہر لمحہ وجود میں آرہے ہیں۔

ان اعداد وشمار سے یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ جس جنت کی تخلیق کی تیاری کررہے ہیں وہ انسانوں کے اندازوں سے کہیں زیادہ بڑی ہے اور اس میں ملنے والا اجر اس سے کہیں زیادہ ہے کہ انسان کے ہر لمحے کے بدلے میں اسے 252 کھرب میل دور ایک ستارہ دے دیا جائے۔ چنانچہ ایک بندۂ مؤمن کو زندگی کا ہر لمحہ یہ سوچ کر گزارنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے پاس اسے دینے کے لیے بہت کچھ ہے۔ اتنا کچھ کہ وہ ایک لمحے میں کم از کم 252 کھرب میل کی ترقی حاصل کرسکتا ہے۔ اس کے مقابلے میں میں نے آٹھ گھنٹوں میں کل پانچ ہزار میل طے کیے تھے جو یقیناً بہت کم ہیں۔ لیکن جدید سائنس میں انسان کی ترقی نے اس کو ان امکانات سے ضرور آگاہ کردیا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے وقت میں رکھ دیے ہیں۔ وقت کیسا عظیم خزانہ ہے مگر لوگ کس بے دردی سے اسے ضائع کرتے رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے

کہ اللہ تعالیٰ کی جنت میں سوارب انسانوں میں سے بہت کم ہی جاسکیں گے۔

سنگاپور: جدید مغربی دنیا کا مشرقی ایڈیشن

ہم سنگاپور تین دن رہے۔ ان تین دنوں میں اس شہر کے متعلق میرا تاثر یہی قائم ہوا کہ یہ جدید مغربی دنیا کا مشرقی ایڈیشن ہے۔ سیموئل ہنٹنگٹن نے سرد جنگ کے بعد کی دنیا کے حوالے سے یہ بحث اٹھادی تھی کہ آئندہ جنگ نظریات کے مابین نہیں بلکہ تہذیبوں کے مابین ہوگی۔ آنے والی دنیا میں ایک طرف مغربی تہذیب ہوگی جس نے دورِ جدید کو جنم دیا ہے اور دوسری طرف اس کے مدمقابل مسلم اور چینی تہذیبیں ہوں گی۔ ہنٹنگٹن کی پیش گوئی کے مطابق مسلم اور مغربی تہذیب کا ٹکراؤ شروع ہوگیا ہے۔ جبکہ چینی تہذیب کی قیادت چونکہ انتہائی باشعور لیڈر کررہے ہیں اس لیے وہ اپنی تہذیب کو ہر قسم کے ٹکراؤ سے بچا کر معاشی اور فوجی ترقی کی راہ پر گامزن کیے ہوئے ہیں۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ مسلم مغرب ٹکراؤ میں دونوں تہذیبیں بے حد کمزور ہوجائیں گی اور اس کے بعد چینی تہذیب باآسانی پوری دنیا پر غالب ہوجائے گی۔

خیر بات ایک دوسری طرف نکل گئی۔ اصل بات جسے میں زیرِ بحث لانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ہنٹنگٹن کے مطابق دنیا بھر میں تیزی سے پھیلتا ہوا جدید کلچر جو بظاہر مغربی کلچر کے غلبہ کا تاثر دیتا ہے یعنی مغربی لباس، پیپسی، میکڈونلڈ وغیرہ مغربیت کی علامت نہیں، بلکہ جدیدیت کی علامت ہے۔ یہ اثرات کسی عالمی مغربی تہذیب کو پیدا نہیں کرتے بلکہ مختلف تہذیبوں کے جدید ہونے کی علامت ہیں۔

مشرق کے جدید ہونے والی بات مجھے سنگاپور آکر ٹھیک محسوس ہوئی۔ میں نے جتنے جدید اور ترقی یافتہ مغرب کے بڑے شہروں کو دیکھا، اتنا ہی جدید اور ترقی یافتہ سنگاپور محسوس ہوتا تھا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ سنگاپور معیارِ زندگی کے اعتبار سے دنیا کے معیاری ترین ملکوں میں

سے ایک اور ایشیا میں جاپان کے بعد دوسرا ملک ہے۔ یہاں کی بلند عمارات، پبلک ٹرانسپورٹ کا نظام، بڑے بڑے شاپنگ سنٹر، تہذیبِ جدید کے دیگر مظاہر یعنی تیز زندگی، عورتوں کا بڑی تعداد میں گھر سے باہر نکل کر کام کرنا، کھانا گھر سے باہر کھانا، غرض ہر چیز زبانِ حال سے یہ بتارہی تھی کہ یہ ایک ترقی یافتہ ملک ہے۔ مکڈونلڈ، پیپسی اور مغربی لباس بہت عام تھا۔ بلکہ جو حبس زدہ اور گرم موسم ہمیں ملا تھا اس میں لباس کچھ کم کم ہی تھا۔ خواتین کی عریانی سے محسوس ہوتا تھا کہ میں جون جولائی میں نیویارک آگیا ہوں۔ اسی طرح نوجوان جوڑوں کے سرعام معاملات بھی وہی تھے جو مغرب میں معمول ہیں۔ اس لیے میں سیموئل ہنٹنگٹن کی اس بات سے تو اتفاق کرتا ہوں کہ یہ جدیدیت ہے، مگر یہ درست نہیں کہ یہ مغربیت نہیں ہے۔ میرے نزدیک اصل بات یہ ہے کہ مغرب کا صرف جدید پہلو(Modernization) ہی نہیں بلکہ مادیت، اعراضِ خدا، عریانی اور اخلاق باختگی کا پہلو بھی تیزی سے مشرق میں پھیلا ہے۔ اسی کو میں نے جدید مغربی دنیا کے مشرقی ایڈیشن سے تعبیر کیا ہے۔

میں پوری دیانت داری سے یہ سمجھتا ہوں کہ دنیا کو صرف مادی آنکھ سے دیکھنے کا دجالی وصف تمام اقوام عالم میں عام ہوچکا ہے۔ سنگاپور جہاں اور اعتبار سے مشرق کا جدید مغربی ایڈیشن ہے وہیں مادیت پر مبنی مغربی تہذیب کا ایک مکمل پیرو بھی ہے۔ یہ مغرب سے سیاسی اور ثقافتی طور پر مختلف ہے لیکن اصلاً یہ پیروئ مغرب ہی کی راہ پر گامزن ہے۔

مشینی دور کا انسان

سنگاپور مجھے کئی وجوہ سے زیادہ پسند نہیں آیا۔ ایک یہ کہ ہمیں بہت گرم مرطوب موسم ملا تھا۔ اس خطے میں روزانہ دوپہر تک شدید گرمی اور شام میں بارش ہوتی ہے۔ مگر ان دنوں سنگاپور میں بارشیں نہیں ہورہی تھیں البتہ گرمی بہت تھی۔ دوسرے اس کی اصل کشش اس کا جدید طرزِ تعمیر ہے

جو بعض دیگر لوگوں کے لیے تو شاید بہت پرکشش ہو، مگر میرے پس منظر کی وجہ سے میرے لیے کوئی نئی چیز نہ تھا۔ شروع شروع میں یہ پررونق، عالیشان اور چمکدار زندگی انسان کو متأثر کرتی ہے، مگر آہستہ آہستہ انسان کو محسوس ہوتا ہے کہ یہ مادیت کا وہ سمندر ہے جس میں انسان بھیڑ میں بھی تنہا رہتا ہے۔ پھر یہ کہ سنگاپور بہت مہنگا شہر ہے۔ خاص کر سیاح کا تعلق اگر پاکستان سے ہو تو کرنسی کے فرق (سفر کے وقت ایک سنگاپوری ڈالر پچاس روپے کا تھا، سفرنامہ کی اشاعت کے وقت یہ فرق ساٹھ روپے کا ہو چکا ہے) کی وجہ سے مہنگائی کا احساس اور بھی زیادہ ہوتا ہے۔

تاہم میرے ذوق سے قطع نظر کافی تعداد میں سیاح سنگاپور آتے ہیں۔ قارئین کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ اس ملک کی آبادی سے زیادہ سیاح یہاں آتے ہیں۔ ان کے لیے یہاں تفریح کی کئی جگہیں بنائی گئی ہیں۔ ان میں سب سے نمایاں جگہ سنٹوسا کا جزیرہ ہے۔ اوپر اس علاقے کا جو نقشہ میں نے کھینچا ہے اس میں سنگاپور سے آگے مزید جنوب کی سمت شہر سے بالکل متصل ایک جزیرہ ہے۔ یہی سنٹوسا ہے۔ دراصل دنیا بھر میں دستور ہے کہ ساحل سمندر پر واقع بڑے اور اہم شہروں سے قریب جو جزیرے ہوتے ہیں انھیں بہترین تفریحی مقام میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ یہی کچھ سنٹوسا کے ساتھ ہوا ہے۔ اس موقع پر قارئین یہ نہ سوچنے لگ جائیں کہ پاکستان میں ایسا کیوں نہیں ہوتا۔ کیوں کراچی کے اردگرد موجود دسیوں جزائر میں سے کسی ایک جزیرے کو اس مقصد کے لیے منتخب نہیں کر لیا جاتا؟ بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں کراچی جیسے عظیم الشان اور گنجان شہر میں ابھی تک ماس ٹرانزٹ پروگرام نہیں بن سکا تو اور کیا ہوگا۔ یہی حال ملک کے دیگر بڑے شہروں کا ہے۔ ہمارے ہاں انسانوں کو جانوروں کی طرح بسوں اور ویگنوں میں ٹھونس کر سفر کا طریقہ رائج ہے اور جب تک عوام نااہل اور کرپٹ سیاسی لیڈرشپ کی اندھی پیروی جاری رکھیں گے، یہ سلسلہ بھی جاری رہے گا۔

اس جزیرے میں سیاحوں کی تفریح کے لیے ساحل سمندر کے علاوہ اور بہت سی چیزیں بھی تھیں۔ تاہم یہاں کی سب سے زیادہ منفرد چیز ایک لیزر شو تھا۔ یہ لیزر شو کئی ملین ڈالر کی رقم کا ایک پروجیکٹ تھا جس میں ساحل سمندر کے ایک حصے پر روزانہ شام کے وقت پریوں کی ایک سادہ سی کہانی سنائی اور دکھائی جاتی ہے۔ مگر اس سادہ کہانی کو آتش بازی، رقص کرتے فواروں اور سب سے بڑھ کر لیزر کی دلکش اور رنگ برنگی روشنیوں کی مدد سے بیحد حسین اور خوبصورت انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس شو میں لیزر کے ذریعے سے سہ جہتی (Dimentional Three) تصویریں اس قدر خوبصورتی سے بنائی گئیں اور مختلف اسپیشل افیکٹ اس طرح بکھیرے گئے کہ الفاظ شاید اس کا حقیقی بیان نہ کر سکیں۔ ہزاروں لوگ دم سادھے یہ شو دیکھتے رہے۔

یہ انسانوں کی ترقی کا ایک اعلیٰ نمونہ تھا۔ مگر اس شو سے ذرا قبل سمندر کے اوپر ڈھلتے اور ڈوبتے سورج کے ساتھ آسمان پر شفق کا ایک انتہائی حسین منظر تھا۔ سمندر کا نیلا، سورج کا پیلا، شفق کا گلابی، آسمان کا سرمئی، بادلوں کا سفید اور ان سے منعکس ہوتی سورج کی کرنوں کا سنہری رنگ؛ رنگوں کا ایک گلدستہ تھا جسے فطرت اپنے دنوں ہاتھوں میں تھامے انسان کو پیش کر رہی تھی، مگر انسان اس سے بے پرواہ ہو کر اپنے ہنگاموں میں، اپنی باتوں میں مگن تھا۔ یہ معاملہ انھی لوگوں تک خاص نہ تھا آج ہر جگہ یہی معاملہ دیکھا جا سکتا ہے۔ فطرت کوئل کی صورت کوکتی ہے، چڑیوں کی شکل میں چہچہاتی ہے، ہوا کے جھونکوں سے انسانی وجود کا مساج کرتی ہے، شفق کے رنگوں سے آسمان کو مزین کرتی ہے، پھولوں کی خوشبو سے زمین کو معطر کرتی ہے، سمندروں کی وسعت، سورج کی تپش، ہواؤں کی طاقت اور بادلوں کی حرکت کو ملا کر بارش کے قطروں سے دھرتی کی پیاس بجھاتی ہے، مگر انسان...... مشینی دور کا یہ انسان

اس سے بے پرواہ ہو کر کیسی غفلت اور محرومی میں جیتا ہے؟

دورِ جدید نے انسان سے سب سے بڑھ کر فطرت سے تعلق چھینا ہے۔ یہ قطعِ تعلق اگر فطرت تک رہتا تو پھر بھی غنیمت ہوتا۔ مگر انسان نے تو فاطر السموات و الارض سے بھی تعلق توڑ لیا ہے۔ وہ خدا فراموش ہوگیا ہے۔ اسے شاید ایسا ہونا ہی چاہیے۔ جن کے پاس کتاب الٰہی ہے، جب وہ خدا کو بھول چکے ہیں تو پھر دوسرے تو اس غفلت کے زیادہ حقدار ہیں۔ میں نے کہیں لکھا تھا اور پھر دہرا دیتا ہوں۔ خدا آج ہماری دنیا میں مصیبت میں پکارا جانے والا ایک نام ہے اور کچھ نہیں۔ اس کا کلام بے سمجھے پڑھی جانے والی ایک کتاب ہے اور کچھ نہیں۔ اس کا رسول سوا ارب مسلمانوں کا فخر ہے اور کچھ نہیں۔ ایسے میں کسی چینی، یورپی، ہندو اور انگریز سے کیا شکایت کی جائے!

سنگاپور کے اہم مقامات

ذکر ہو رہا تھا سنگاپور کے اہم مقامات کا۔ سنٹوسا میں اس لیزر شو کے علاوہ اور بھی کئی دلچسپ چیزیں تھیں لیکن لیزر شو بلاشبہ ان میں سب سے بہتر تھا۔ ہمارے لیے سنگاپور کا ایک دوسرا دلچسپ تجربہ سنگاپور ریور کی سیر تھا۔ ہمارا ہوٹل اس دریا کے کنارے واقع تھا۔ کمرے کی کشادہ کھڑکی سے نظر اٹھا کر دیکھتے تو آسمان کو چھوتی سنگاپور شہر کی خوش رنگ اور خوبصورت عمارتیں نظر آتیں اور نظر جھکانے پر دھیمے انداز میں بہتے دریا کا نظارہ سامنے آجاتا۔ اس کے ساتھ ہی ہوٹل کا انتہائی خوبصورت سوئمنگ پول تھا۔ یہ ایک انتہائی حسین منظر تھا جو کمرے کی کھڑکی سے کسی scenery کی طرح مستقل نظر آتا۔ میں سنگاپور کے حبس زدہ اور گرم موسم کی وجہ سے اس شہر میں زیادہ محظوظ نہیں ہوسکا تھا۔ مگر ہوٹل کے خنک کمرے میں بیٹھ کر جب میں اس منظر کو دیکھتا تو ساری کلفت دور ہو جاتی۔ اس منظر کو دیکھ کر یوں لگتا کہ گویا وقت ٹھہر گیا ہے، زندگی کی نبض چلتے چلتے دم لینے کو

رک گئی ہے اور گردشِ زمانہ اپنی تکان اتارنے کے لیے کچھ دیر کو ساکن ہوگئی ہے۔

ہمارے ہوٹل کے قریب ہی وہ جگہ تھی جہاں سے دریا کی سیر کے لیے لوگ کشتی میں بیٹھ کر روانہ ہوتے تھے۔ اس کشتی میں سنگاپور اور اس دریا کی تاریخ اور اہم مقامات کا تعارف بھی کرایا جاتا تھا۔ یہ کشتی سٹی سنٹر کے علاقے کے قریب تک جاتی تھی جہاں مارلین (Merlion) اسٹیچو نصب تھا۔ یہ اسٹیچو سنگاپور کی پہچان ہے جو اپنے سر سے شیر کی طرح اور دھڑ کے نیچے سے مچھلی کی طرح نظر آتا ہے۔ اس کے منہ سے فوارے کی طرح مستقل پانی نکلتا رہتا ہے۔ اس کی ایک بڑی سی نقل سنٹوسا جزیرے میں بھی نصب کی گئی ہے۔

ہم سنگاپور کے لٹل انڈیا کے علاقے میں بھی گئے جو ہندوستان سے آئے ہوئے لوگوں کی آبادی کا علاقہ ہے۔ یہاں ایک بڑی مسجد بھی تھی۔ لٹل انڈیا میں واقع مصطفیٰ سنٹر بہت مشہور ہے۔ تاہم شاپنگ کے لیے اصل شہرت آرچرڈ روڈ کی ہے جو اپنے بڑے بڑے شاپنگ سنٹرز کے لیے معروف ہے۔ مجھے البتہ ان سے کہیں زیادہ بہتر جیٹی پر بنا ہوا ویوو (Vivo) شاپنگ سنٹر لگا جہاں سے ہم منی ٹرین میں بیٹھ کر سنٹوسا کے لیے گئے تھے۔ میرے اس مشاہدے کی تائید بعد میں اس وقت ہوگئی جب وہاں یہ لکھا ہوا دیکھا کہ اس شاپنگ سنٹر نے پچھلے برس سیاحوں کے سب سے پسندیدہ شاپنگ سنٹر کا ایوارڈ حاصل کیا ہے۔

اس کے علاوہ سنگاپور کا چڑیا گھر، بوٹانیکل گارڈن، نائٹ سفاری، برڈ پارک وغیرہ بھی سیاحوں کے پسندیدہ مقامات ہیں، مگر میں گرمی کی وجہ سے ان میں سے کسی جگہ جانے کی ہمت نہ کرسکا۔ البتہ سنگاپور میں نئے متعارف ہونے والے اس بلند پہیے میں بیٹھنے ضرور گیا جو ایشیا کا سب سے بلند پہیہ ہے کیونکہ مجھے بلند مقامات پر چڑھنا بہت پسند ہے۔ مگر جس وقت ہم وہاں پہنچے وہ بند ہو چکا تھا۔ اگلے دن ہماری روانگی تھی اس لیے یہ حسرت دل میں لیے ہم ملائیشیا روانہ ہوئے۔

مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ

سنگاپور میں ہم تین دن رہے۔ ان تین دنوں میں ہمارا واسطہ ایک گرمی برساتے سورج سے رہا، لیکن یہ سورج مشرق سے ابھر رہا تھا اس لیے علامہ اقبال کے حکم کی تعمیل میں شعور کی آنکھ جھپکنے نہ دی۔

کھول آنکھ زمین دیکھ فلک دیکھ فضا دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ

گو اس شہر کی بلند و بالا عمارات میں فلک اور فضا کم ہی نظر آتے تھے۔ جو نظر آتا تھا وہ مادیت کی بہار تھی یا عریانی کی یلغار۔ باقی جس انسان کو اقبال نے آنکھیں کھولنے کا مشورہ دیا تھا اس کی روح شاید خدا بیزار ہو چکی ہے۔ اس لیے وہ اقبال کی اس نصیحت پر عمل کرنے کے قابل ہی نہ تھی جو انہوں نے اسی معرکۃ الآرا نظم میں اس طرح کی تھی:

اُس جلوۂ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ

خدا نے انسان کو اس دنیا میں بھیج کر اپنے آپ کو فطرت کے پردوں میں اس لیے چھپا لیا کہ اس کے مشتاق اس جلوۂ بے پردہ کو لاکھ پردوں میں بھی پہچان لیں اور پیشانی کے بل اس کے سامنے گر پڑیں۔ لیکن مادیت کے اس دھویں نے آج کے انسان کے لیے خدا کے ہر منظر کو دھندلا دیا ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ قیامت سے قبل ایک دفعہ یہ دھند ضرور چھٹے گی۔ ایسے لوگ اٹھیں گے جو اپنے خونِ جگر سے تخلیق کیے گئے الفاظ میں خدا کی حمد، اس کی پاکی، اس کی کبریائی اور اس کی توحید کے وہ نغمے بکھیریں گے کہ ہر سلیم الفطرت شخص شک و شبہ کی دھند کا سینہ چاک کر کے اپنے پروردگار تک جا پہنچے گا۔ پھر اس کے بعد بہت جلد وہ وقت آئے گا جب خدا کی روشنی کا سورج طلوع ہو گا اور زمین اپنے رب کے نور

سے چمک اٹھے گی۔ اور اس کے ساتھ ظلم، ناانصافی، گمراہی اور شیطانیت کا ہر تاریک سورج ہمیشہ کے لیے غروب ہو جائے گا۔

سنگاپور میں مادیت کی دھند کے باجود دنیا کے نئے سیاسی منظر نامے کو مشرق کی اس سرزمین سے طلوع ہوتے سورج کے ذریعے سے ضرور دیکھا جا سکتا ہے۔ صاف نظر آتا ہے کہ کچھ عرصے قبل تک انتہائی پستی اور بدحالی کا شکار چینی نسل انسانیت کی امامت مغرب سے لیکر مشرق کو منتقل کرنے کے لیے تیار ہو چکی ہے۔ دور جدید کی امامت کا سورج آج ہر معنی میں مشرق سے طلوع ہو رہا ہے۔

معاشی میدان میں چینی اقوام کی پیش قدمی سے تو دنیا واقف ہے ہی لیکن فوجی اور سائنسی میدان میں بھی وہ تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ اسی سفر میں پاکستان واپس لوٹتے ہوئے معروف امریکی جریدے نیوز ویک کی ایک رپورٹ پڑھنے کا موقع ملا۔ جس میں بیان کیا گیا تھا کہ چین نے امریکہ کی مشرق وسطیٰ اور افغانستان میں توجہ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے خاموشی سے بحیرۂ چین میں واقع (Hainan) جزیرے پر ایک فوجی اڈہ قائم کر لیا ہے۔ اس اڈے پر بلاسٹک میزائلوں سے لیس ایٹمی آبدوزیں، بحری جنگی جہاز اور طیارہ بردار جہاز تعینات ہوں گے۔ اس اڈے کے اردگرد پہاڑیوں کو کاٹ کر سرنگیں بنائی گئی ہیں تا کہ کسی سیٹلائٹ سے اڈے پر آبدوزوں کی آمد و رفت کا علم امریکہ کو نہ ہو سکے۔ اس طرح چین صرف بحیرۂ چین ہی نہیں بلکہ بحر ہند کے اطراف میں واقع ممالک اور تجارتی شاہراہوں کی ناکہ بندی کے قابل ہو گیا ہے۔ جنگ عظیم دوم کے بعد سے اس خطے میں امریکی بحریہ کی برتری قائم تھی جسے چین اب چیلنج کرنے کے قابل ہو گیا ہے۔ اس رپورٹ کی تفصیل درج ذیل ہے:

An Underwater Threat

By Daniel Blumenthal | NEWSWEEK

30 May 2008

As America and its allies focus their diplomatic energy on the Middle East and Afghanistan, China continues to alter the balance of power in East Asia with little fanfare and even less resistance. Consider recent revelations that China has built a massive new naval base in Sanya, on Hainan Island. The strategically located base, which features underground facilities, provides the Chinese Navy with hard-to-monitor deep-water access to the South China Sea and the Indian Ocean region, as well as the ability to project military power in and trade routes considered vital to all Asian countries. Since World War II, the U.S. Navy has policed these sea routes. Washington and its allies have provided the security that has underwritten Asia's remarkable growth in trade and prosperity. By building a Navy capable of taking on U.S. forces, however, it seems Beijing is now seeking to contest that U.S. maritime dominance—a move that could seriously undermine peace and prosperity throughout Asia.

The new base at Sanya will be able to handle numerous

nuclear submarines, destroyers and, when China decides to build them, aircraft carriers. Already, China's latest Jin–class nuclear ballistic-missile submarine has been spotted at the base, just a few hundred kilometers from China's Southeast Asian neighbors, such as Vietnam. Complicating matters further, Beijing has driven massive tunnels into hillsides surrounding the base, which will let China shield its subs from detection by satellites and leave Washington practically blind when those subs do deploy.

To close observers of the Chinese military, the base's construction is just the latest in a sustained Chinese effort to rapidly build up its military, particularly its Navy. Since 1995, when most countries were shrinking their defense budgets and downsizing their militaries in the aftermath of the cold war, China has commissioned more than 30 new submarines. It has acquired or is building at least five different classes of subs—a number unmatched by any other military. In addition to this ever-growing underwater force, Beijing has launched an impressive array of advanced destroyers, fielded more than 1,000 ballistic missiles since the early 1990s at a rate of 150 a year, and acquired hundreds of the most modern fighter aircraft. Many experts on the Chinese military tend to explain

away this rapid buildup as necessary to deterring Taiwan's independence. But China faces no serious challenge from Taiwan, and Taiwan's military has done comparatively little to augment its firepower over the past decade. The fact is that for some time now, China has had more than enough military capacity to deter Taiwan from formally breaking with the mainland. Indeed, if anything, the worry today is that China can coerce Taiwan into a settling their dispute on Beijing's terms. It also hasn't escaped notice from others in the neighborhood that all these new military capabilities targeting Taiwan could also be used for alternative purposes.

Given that China faces a benign security environment with no real threats, its true military goals remain a mystery. Privately, however, U.S. officials are voicing concern. The Pentagon estimates that by 2010, China's will be able to deploy five submarines equipped with nuclear-tipped ballistic missiles, making its nuclear force far more powerful and likely to survive an attack.

The Americans aren't the only ones growing nervous. Last week, the Indian cabinet discussed China's new base, and the Indian Navy chief expressed serious concern. He rightly suspects that a stronger Chinese nuclear Navy means that

Beijing may plan on challenging Delhi's longtime dominance of the Indian Ocean. Tokyo, for its part, is increasingly worried that its old rival is developing the ability—and the intention—to project power around Japan with impunity. Over the past few years, Japanese officials have reported dozens of Chinese maritime incursions into disputed waters close to Japan's shores. And China will soon have the hardware to allow it to forcefully settle claims to disputed islands in the South China Sea—much to the consternation of the Philippines and Vietnam.

Nothing less than the future of East Asia now hangs in the balance. For many years, America's security umbrella over the region has allowed Asia's great powers, including China, to focus on economic growth rather than military competition. Now China's rapid buildup could spark a costly regional competition that could potentially slow Asia's economic growth, as funds are diverted to military spending and investors are scared away.

سنگاپور اس اعتبار سے چینی اقوام کا امام ہے کہ مشرق کی ترقی کا عمل سب سے پہلے اسی سرزمین پر شروع ہوا۔ 250 مربع میل کے رقبے اور پچاس لاکھ سے کم آبادی کی یہ شہری ریاست تاریخی طور پر ملائیشیا کا ایک حصہ تھی۔ انیسویں صدی میں یہ جنگلات پر مشتمل ایک دلدلی علاقہ تھا۔ اس علاقے

کی حالت اس وقت بدلنا شروع ہوئی جب 1819 میں یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر انتظام آیا۔ کمپنی کا مقصد مشرق بعید، انڈیا اور یورپ کے درمیان پھیلی ہوئی اپنی تجارت کے لیے اسے ایک بحری اڈے کے طور پر استعمال کرنا تھا۔ 1959 تک یہ برطانیہ کے زیر انتظام ایک فری پورٹ کے طور پر کام کرتا رہا۔ 1963 میں ملائیشیا کے ساتھ شامل ہوا مگر دو برس بعد سیاسی اختلافات کی بنیاد پر اس نے مکمل آزادی حاصل کر لی۔ ملک کی مدبر اور مخلص قیادت نے (قارئین کو پاکستانی تناظر میں یہ الفاظ شاید کچھ نامانوس لگیں، جس کے لیے معذرت، لیکن جب تک قوم اپنے لیڈروں کا احتساب نہیں کرے گی نااہل قیادت ہمارا مقدر رہے گی) فری پورٹ سے آگے بڑھ کر جلد ہی ملک کو ایک صنعتی پیدواری ملک بنا دیا اور یوں سنگاپور ایشیا کے ٹائیگرز میں شامل ہو گیا۔

ایشیا کے اس ٹائیگر کی ترقی کی عکاس صرف فلک بوس عمارتیں ہی نہیں بلکہ ان کا ٹرانسپورٹیشن سسٹم بھی ہے جو کہ MRT کہلاتا ہے۔ یہ کسی اعتبار سے مغربی ممالک سے کم نہیں بلکہ کئی اعتبار سے ان سے بہتر ہے۔ ظاہر ہے یہ سب کچھ دیکھ کر اور اپنے وطن سے اس کا موازنہ کر کے میرا دل دکھا۔ خاص کر اس موقع پر جب MRT کی ٹرین میں بیٹھ کر دہشت گردی کے خلاف لوگوں کو ہوشیار رکھنے کے لیے بار بار نشر کی جانے والی وڈیو دیکھی۔ لندن اور میڈرد میں ٹرین بم دھماکوں کے بعد دنیا بھر میں پبلک ٹرانسپورٹ نظام کے حوالے سے بہت احتیاط برتی جاتی ہے۔ ان دونوں جگہوں پر دھماکوں میں مسلمانوں ہی کا نام لیا گیا تھا۔ اس لیے جب جب یہ وڈیو چلی مجھے یہ محسوس ہوا کہ میں مسلمان ہوں اور ہر شخص مجھے ہی دہشت گرد سمجھ رہا ہے۔

یہ صورتحال ہماری اس لیڈرشپ کا تحفہ ہے جو صرف نفرت اور جنگ کو ہر مسئلے کا حل سمجھتی ہے۔ جو صبر، حکمت اور دعوت کو بے معنی باتیں سمجھتی ہے۔ جو طاقت کے بغیر دشمن سے ٹکرا جانے کو بہادری سمجھتی ہے۔ اس کے برعکس وہ چینی قیادت ہے جو ٹکراؤ سے ہٹ کر تعمیر کے راستے پر چل

رہی ہے۔ جو صرف اس میدان میں اترتی ہے جہاں اس کی فتح یقینی ہو۔ اس مقصد کے لیے ان کا پہلا میدان معاشی ترقی تھی۔ دوسرا میدان تعلیم و تربیت ہے جس میں وہ مستقل آگے بڑھ رہے ہیں۔ فوجی میدان میں بھی ان کی دانشمندی اس واقعے سے عیاں ہوتی ہے جسے میں نے اوپر بیان کیا ہے کہ جو میدان انہیں خالی ملا اس میں انہوں نے خاموشی سے اپنا غلبہ قائم کر لیا۔ وہ جانتے ہیں کہ امریکہ مشرق وسطیٰ اور وسط ایشیا میں ان کی مداخلت گوارا نہیں کر سکتا اور نہ وہ امریکہ کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اس لیے انہوں نے ایک بہت بڑے اور مستقبل کے انتہائی اہم میدان یعنی بحر ہند پر اپنی برتری قائم کر لی جو بالکل خالی پڑا تھا۔

اس دنیا میں کامیابی کسی خوش قسمتی کا نتیجہ نہیں ہوتی۔ کامیابی اپنے امکانات سمجھنے اور انہیں استعمال کرنے کا نام ہے۔ چینی قوم نے اس فن کو سیکھ لیا ہے اور یہی ان کی ترقی کا راز ہے۔

ملائیشیا کا سفر

ہم ہفتے کی صبح بذریعہ بس ملائیشیا روانہ ہوئے۔ یہ سفر تقریباً چھ گھنٹے کا تھا۔ ہموار اور کشادہ سڑک پر ایک آرام دہ بس میں یہ سفر بہت سہولت کے ساتھ طے ہوا۔ راستے میں دونوں ممالک کا باڈر آیا۔ بس میں موجود سنگاپور اور ملائیشیا کے شہری باآسانی دوسری طرف چلے گئے۔ مگر ہمیں ویزہ لینے ایک دوسرے کمرے میں جانا پڑا۔ میرا خیال یہ تھا کہ ہمارے پاسپورٹ پر ایک انٹری ہوگی، جیسا کہ سری لنکا وغیرہ میں پاکستانیوں کے لیے ہوتی ہے مگر یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ ہمیں ویزہ لینا ہوگا۔ ویزے کے لیے وہاں موجود افسروں نے ہماری واپسی کے ٹکٹ، ہوٹل ریزرویشن وغیرہ چیک کیے۔ اس کے بعد ویزہ فیس کا مطالبہ کر دیا۔ میرے پاس مطلوبہ تعداد میں رنگٹ (ملائیشیا کی کرنسی) نہ تھی۔ بارڈر پر ڈالر ایکسچینج کرنے کی کوئی جگہ اور انتظام نہ تھا۔ دوسری طرف مجھے یہ اندیشہ تھا کہ بس والا ہمیں چھوڑ کر نہ چلا جائے

کیونکہ ہمارے سوا سب لوگ انٹری کروا کر بس میں بیٹھ چکے تھے۔ میں نے ویزہ افسر کو یہ مسئلہ بتایا۔ آخر کار اس نے ایک آدمی سے بات کی اور ہمیں منہ مانگی قیمت پر مطلوبہ تعداد میں رنگٹ خریدنے پڑے۔ کچھ دیر میں ہمیں ویزا مل گیا اور ہم آگے روانہ ہوئے۔

اس واقعے کے بعد بس کے پرسکون ماحول میں بیٹھ کر میں سوچنے لگا کہ یہ کیسی غیر متوقع اور پریشان کن صورتحال پیدا ہوگئی تھی۔ مجھے انٹری ویزا اور اس کی فیس کا معلوم ہوتا تو سنگاپور سے رنگٹ لے کر آتا۔ میں نے تو راستے کی ضروریات کے لیے رنگٹ خریدے تھے اور باقی ملائیشیا میں لینے کا ارادہ تھا۔ معلوم ہوتا تو ڈرائیور کو بھی بتا دیتا کہ میرا انتظار کرنا اور پھر سکون سے سارا معاملہ ہوتا۔

بے اختیار اللہ تعالیٰ سے روزِ حشر کی پریشانی سے پناہ مانگی۔ وہاں کچھ لوگ میری طرح بڑے اطمینان اور اعتماد سے پہنچیں گے کہ سب ٹھیک ملے گا۔ فرشتے ہر مسلمان سے بس کلمہ سنیں گے اور جنت کی انٹری کا ٹھپا لگا کر کہیں گے کہ مزے کرو۔ کوئی اور مسئلہ ہوا تو شفاعت تو ہو ہی جانی ہے۔ مگر قرآن تو بتاتا ہے کہ سچے ایمان اور عملِ صالح کے بغیر جو شخص آئے گا اس کے لیے اس روز پریشانی ہی پریشانی ہوگی۔ ان کا سارا اعتماد اور یقین بھاپ کی طرح اڑ جائے گا۔ اول تو کسی کے پاس کوئی مال و متاع ہوگا نہیں پھر اگر ہوا بھی تو دنیا کے ڈالرز کو جنت میں قابلِ قبول رنگٹ میں بدلنے والا کوئی شخص نہ ہوگا۔ جنھوں نے انسانوں کے حقوق مارے اور ظاہری عبادات ادا کرتے رہے، ان کے درمیان البتہ ضرور لین دین ہوگا۔ اس طرح کہ جس کا مال کھایا، اپنی نیکیوں کو بدلے میں اسے دینا ہوگا اور آخر کار ساری نیکیاں بھی ختم ہو جائیں گی۔ پھر اس کے گناہ اپنے سر لینے ہوں گے۔ کیسا برا اعتماد ہے جو آدمی کو اس انجام تک پہنچا دے گا۔

زمین کے دو زیور

ملائیشیا میں داخل ہوتے ہی دو تاثر قائم ہوئے جو آخری وقت تک رہے۔ ایک یہ کہ درخت زمین کا زیور ہیں اور ملائیشیا کا چپہ چپہ اس زیور سے سجا ہوا ہے۔ دوسرا یہ کہ حیا عورت کا اصلی زیور ہے۔ یہ زیور سنگاپور میں جتنا کمیاب تھا یہاں اتنا ہی وافر موجود تھا۔ ملائیشیا میں ہر چھوٹی بڑی جگہ خواتین کام کرتی ہوئی نظر آئیں مگر چینی نسل کی خواتین کے برعکس ہاتھ اور چہرے کو چھوڑ کر وہ مکمل طور پر ڈھکی ہوئی ہوتی تھیں۔

لباس کسی خاتون کی حیا کا معیار تو نہیں ہوتا لیکن اس کا ایک اظہار ضرور ہوتا ہے۔ ملائیشیا کی خواتین نے اگلے ایک ہفتے میں ہمیں یہ بتایا کہ انتہائی گرمی کے موسم میں جب باریک، چست اور کم لباس کو دنیا بھر کی خواتین اپنی مجبوری بنالیتی ہیں، باحیا خواتین نہ صرف گھر سے باہر انتہائی سخت موسم میں کام کرسکتی ہیں بلکہ لباس میں بھی اپنی حیا اور عفت کے تقاضوں کو ملحوظ رکھ سکتی ہیں۔ خدا کی نظر میں زمین کا اصل زیور یہی باحیا خواتین ہیں۔ کل قیامت کے دن خدا ان کو جنت کے زیور پہناتے وقت بہت سخاوت سے کام لے گا۔

اس سفر میں کئی پاکستانی خواتین نظر آئیں۔ کاش وہ بھی مقامی خواتین سے کچھ سبق سیکھ لیتیں۔ وگرنہ لگتا یہی تھا کہ انہوں نے یہی سبق سیکھا ہے کہ ملک میں رہتے ہوئے جو رہی سہی پابندی ہوتی ہے اسے ائیرپورٹ پر چھوڑ کر آنا چاہیے اور جینز کی پینٹ اور بنیان پہن کر اپنے روشن خیال ہونے کا ثبوت دینا چاہیے۔ میری اہلیہ کے معاملے میں اس حوالے سے ایک دلچسپ چیز سامنے آئی۔ ملائیشیا میں ان سے کئی جگہ لوگ ملائی زبان میں مخاطب ہوئے۔ تھوڑے سے غور و فکر کے بعد اندازہ ہوا کہ یہ ان کے اور مقامی خواتین کے حیادار لباس کی مماثلت کی وجہ سے ہوا ہے۔

حبس زدہ کوالالمپور

میری بہن پروین سلطانہ حنا کا شعر ہے جو مجھے کوالالمپور پہنچ کر بار بار یاد آتا رہا:

جہاں بھی جائیں تماشہ نیا دکھاتا ہے

ہمارے ساتھ ہمارا نصیب جاتا ہے

اس شعر کے یاد آنے کا سبب یہاں کا موسم تھا۔ بچپن میں پڑھا تھا کہ اس خطے کا موسم ایسا ہے کہ روز دو پہر تک سخت گرمی اور حبس ہوتا ہے اور سہ پہر کے وقت بارش ہوتی ہے۔ سنگاپور کے بعد کوالالمپور میں بھی ہمیں صرف حبس اور گرمی ملی، بارش ناراض بیوی کی طرح روٹھی رہی۔ سنگاپور میں بادلوں کے آثار بھی نہ تھے تو دل کو کچھ قرار تھا۔ مگر یہاں تو امنڈتے بادلوں کی بہار بھی بارش کے دل کی کلی نہ کھلا سکی اور وہ بدستور ہم سے خفا رہی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ملائیشیا بلکہ عالمِ اسلام کے ایک ترقی یافتہ شہر میں ہم بہت بے مزہ رہے۔

دراصل سیاح کا سفر موسم کی ہمراہی میں طے ہوتا اور ان کی نظرِ کرم پر منحصر ہوتا ہے۔ باہر کے موسم کی ایک ایک ادا اندر کے موسم پر اثر انداز ہوتی ہے۔ باہر ہی اگر سوکھا پڑا ہو تو دل کی زمین خوشی کی پھوار سے محروم رہتی ہے، منظر ہی اگر صحرا کی طرح تپ رہا ہو تو نگاہوں کو تراوٹ نہیں پہنچا سکتا۔ لیکن ہم سیاح تھے اور موسم کی ہر رُت کے ساتھ ہمیں گزارا کرنا تھا اس لیے حبس اور گرمی کے باوجود ہوٹل سے نکل جاتے اور گھومتے۔ مگر اس کا ایک اثر یہ ہوا کہ تھکان بہت زیادہ ہونے لگی۔

بکٹ بنٹانگ (Bukit Bintang)

ہمارا ہوٹل جس علاقے میں تھا وہ بکٹ بنٹانگ کہلاتا ہے۔ یہ یہاں کا معروف سیاحتی علاقہ ہے جہاں بہت سے ہوٹل، شاپنگ سنٹرز اور سیاحوں کی دلچسپی کی دیگر چیزیں موجود تھیں۔ ہم دن رات میں کئی دفعہ یہ جگہ دیکھنے نکل جاتے۔ یہ پورا علاقہ دیکھنے کے قابل تھا۔ رات کے

وقت یہاں کی روشنیاں اور رونق دونوں عروج پر ہوتیں۔ جبکہ دن کے وقت رونق تو ایسی ہی رہتی لیکن گرمی کی وجہ سے ہم زیادہ تر شاپنگ سنٹرز تک ہی محدود رہتے۔ یہاں ہر قدم پر مقامی ملائی لوگوں کے ساتھ چینی نسل کے لوگ نظر آئے۔ مذہب، ثقافت، زبان، لباس اور دیگر اختلافات کے باوجود دونوں بقائے باہمی کے اصول پر زندگی گزار رہے ہیں۔ میرے علم میں یہ بات پہلے سے تھی کہ چینیوں کو ملائی لوگوں سے کچھ شکایات ہیں، مگر معاملات افہام وتفہیم کے اصول پر چل رہے ہیں۔ ہمارے ہاں جیسے نسلی اور لسانی فساد کی نوبت نہیں آتی۔

گرچہ ملائیشیا کے لوگ مذہبی رجحانات کے حامل ہیں، مگر اس کے باوجود یہاں نائٹ کلب اور شراب کی دکانیں عام ہیں۔ قحبہ گری پر گرچہ پابندی ہے مگر یہ علانیہ یہاں جاری ہے۔ ایک روز میں اور میری اہلیہ ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے سامنے سے گزر رہے تھے کہ دو کال گرلز نے ہمارے آگے جانے والے نوجوانوں سے معاملہ کرنے کی کوشش کی لیکن شاید ان کا معاملہ طے نہ ہو سکا۔ اسی طرح یہاں موجود بین الاقوامی شہرت کے حامل پلانٹ ہالی وڈ سے ایک سرنگ وہاں موجود ایک فائیو اسٹار ہوٹل تک جاتی ہے، اسے Love Tunnel کہا جاتا ہے۔ اس کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ کال گرلز سے معاملہ کرنے کے بعد لوگ انہیں سامنے سے لانے کے بجائے اسی راستے سے لے کر ہوٹل لوٹتے ہیں۔ یہ دورِ جدید کی وہ خرابیاں ہیں جنھوں نے ایک مسلم ملک کو بری طرح آلودہ کر رکھا ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ جب تک تہذیبِ جدید کو الحاد، آخرت فراموشی اور دنیا پرستی سے نکال کر توحید پر استوار نہیں کیا جائے گا یہ مسائل باقی رہیں گے چاہے معاملہ پاکستان کا ہو یا کسی اور مسلم ملک کا۔

اس علاقے کی ایک اور خاص بات چینیوں کے قائم کردہ مساج سنٹر تھے۔ خاص کر پیروں کے مساج کے لیے یہ لوگ بہت اہتمام سے بلاتے تھے۔ اس کا سبب بالکل واضح تھا کہ سیاحوں

کے قدم چلتے چلتے تھک جاتے تھے اور ایسے وقت میں مساج بہت راحت پہنچاتا ہے۔ میرے پیروں میں بھی گرمی میں گھوم گھوم کر شدید درد ہو گیا تھا۔ راستے میں یہ لوگ روک روک کر پیروں کے مساج کے لیے بلاتے تو اس تصور ہی سے سرور آتا، مگر ذہن میں مساج سنٹر کا ایک ایسا منفی تصور راسخ تھا (اور آگے چل کر بینکاک میں یہ سارے تصورات سچائی کے تلخ روپ میں سامنے آ گئے) کہ میں چاہنے کے باوجود پیروں کا مساج نہیں کرا سکا۔

کوالالمپور کی دو بلند عمارات

کوالالمپور کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہاں دنیا کی دو بڑی عمارات موجود ہیں۔ ایک پیٹروناس ٹاور (Petronas Tower) اور دوسری کے ایل ٹاور (KL Tower)۔ پیٹروناس ٹاور امریکہ کے آنجہانی ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی طرح جڑواں عمارتیں ہیں جسے 1998 سے 2004 تک دنیا کی بلندترین عمارت ہونے کا اعزاز حاصل رہا ہے۔ 452 میٹر بلند یہ تعمیر آج بھی جڑواں عمارتوں کی حیثیت سے دنیا کی بلندترین عمارت ہے۔ جبکہ KL ٹاور جس کا اصل نام مینارہ کوالالمپور ہے، ایک کمیونیکشن ٹاور ہے۔ اس کی اونچائی 421 میٹر ہے۔

ہم ان دونوں عمارتوں پر گئے اور وہاں سے شہر کا نظارہ کیا۔ KL ٹاور پر ایک مشاہداتی عرشہ (Observatory Deck) بنا ہوا تھا جس سے شہر کا دلفریب نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ ہم وہاں شام کے وقت گئے جب دن اور رات دونوں میں شہر کو دیکھنا ممکن تھا۔ وہاں ٹاور پر ایک ریسٹورنٹ بھی تھا۔ میں نے وہاں جانے کا ارادہ کیا تو معلوم ہوا کہ پہلے سے ریزرویشن کرانی ہوتی ہے۔ تاہم آنے والے دنوں میں یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ ہمارے ملک کے جمہوری وزیر اعظم اپنے وزرا اور امرا کا لشکر جرار لے کر جب کوالالمپور تشریف لائے تو پاکستانی سفارت خانے نے ان کے اعزاز میں یہاں ایک ڈنر دیا۔ یقیناً اس سے ملائیشیا کے لوگوں کو

اندازہ ہو گیا ہو گا کہ پاکستان کوئی غریب ملک نہیں ہے بلکہ ایک 'ترقی یافتہ' ملک ہے۔ اس ملک کے پاس اتنا فالتو پیسہ ہے کہ وہ اپنے حکمرانوں کو بلندترین جگہ ڈنر کرا کے اقوامِ عالم میں ان کا قد بے دھڑک بلند کر سکتا ہے۔

پیٹروناس ٹاور دیکھنے کے لیے ہم صبح کے وقت گئے۔ پیٹروناس دراصل ملائیشیا کی تیل اور گیس کی کمپنی ہے اور زیادہ تر اسی کے دفاتر ان دونوں عمارتوں میں موجود ہیں۔ ان جڑواں عمارتوں کو اکتالیسویں فلور پر آپس میں ایک پل کے ذریعے سے ملایا گیا ہے جسے اسکائی برج کہتے ہیں۔ چاروں طرف سے بند اور ہوا میں معلق یہ پل عام لوگوں کے لیے روزانہ کھولا جاتا ہے۔ یہاں سے شہر کا نظارہ کرنا ممکن ہے۔ KL ٹاور کے برعکس یہاں کا داخلہ مفت تھا۔ اس کا ٹکٹ منگل سے اتوار تک پہلے آنے والے سترہ سو افراد کو دیا جاتا ہے۔ ٹکٹ سات بجے صبح سے ملنا شروع ہوتے ہیں اور تقریباً نو بجے صبح تک سارے ٹکٹ تقسیم ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد لوگ دن بھر اپنی سہولت کے اعتبار سے یہاں آتے رہتے ہیں اور اس دوران میں عمارت کی ابتدائی منزلوں پر واقع ایک انتہائی شاندار اور بڑے شاپنگ ہال میں خریداری کرتے یا گھومتے ہوئے وقت گزارتے ہیں۔ یہ ساری معلومات ملائیشیا آنے سے قبل میں نے انٹرنیٹ پر حاصل کر لی تھیں۔

سیاہ چہرے

پیٹروناس ٹاور پر ایک بہت غیر معمولی واقعہ پیش آیا جو شاید عمر بھر یاد رہے۔ ہوا یہ کہ ہم اتوار کے دن دوپہر کے وقت یہاں آئے۔ ٹکٹ ملنے کا کوئی سوال اس لیے نہیں تھا کہ عام روایت کے مطابق سارے ٹکٹ صبح نو بجے تک لوگ لے جا چکے ہوتے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ ہمیں صرف شاپنگ سنٹر دیکھنے پر گزارا کرنا ہو گا۔ تاہم وہاں پہنچ کر نجانے کیا دل میں آیا کہ لوگوں سے پوچھ

پوچھ کر اس جگہ چلا آیا جہاں اسکائی برج کی لفٹ میں جانے کا راستہ تھا۔ وہیں ٹکٹ ملنے کا کاؤنٹر تھا۔ میں نے وہاں متعین نوجوان سے پوچھ لیا کہ کیا کوئی ٹکٹ دستیاب ہے۔ اس نے وہی جواب دیا جس کی مجھے توقع تھی کہ سارے ٹکٹ تقسیم ہو چکے ہیں۔

میں اپنی وائف کے ہمراہ وہیں کھڑا ہو کر ٹاور کی تصویریں دیکھنے لگا کہ اتنے میں اس نوجوان نے مجھے آواز دے کر بلایا اور کہا کہ ہمارے پاس دو ٹکٹ کینسل ہوئے ہیں۔ آپ چاہیں تو میں آپ کو ٹکٹ دے سکتا ہوں۔ ہمارے لیے تو یہ اندھے کو دو آنکھیں مل جانے والی بات تھی۔ اس وقت ایک انڈین جوڑا ابھی وہاں موجود تھا۔ انڈین لڑکے نے ٹکٹ والے سے کہا کہ یہ ٹکٹ مجھے دیدیں۔ میں شام کی فلائٹ سے واپس جا رہا ہوں اور یوں اس منظر کو نہیں دیکھ سکوں گا۔ مگر ٹکٹ والے نے اس کے بار بار اصرار کے باوجود یہی جواب دیا کہ جو پہلے آیا ہے اس کو پہلے ٹکٹ دیا جائے گا۔ آخر کار اس نے ٹکٹ مجھے دے دیا۔

اس وقت میں نے ان دونوں انڈین لڑکے اور لڑکی کی جو شکل دیکھی اس میں مجھے قرآن کے ان الفاظ کی تصویر زندگی میں پہلی دفعہ نظر آئی جو اس نے جنت کی بادشاہی کے حصول میں ناکام لوگوں کی منظر کشی کرتے ہوئے کہے ہیں۔ قرآن ان مقامات پر ان لوگوں کے لیے ''سیاہ چہرے'' کی ایک ترکیب استعمال کرتا ہے۔ اس روز ان دونوں کو دیکھ کر مجھے معلوم ہوا کہ ناکامی، امید کا ٹوٹ جانا، کسی انتہائی مطلوب نعمت کا نہ ملنا کس طرح چہرے پر حسرت، غم اور مایوسی کی سیاہی مل دیتا ہے۔ اس کے بعد انتظار گاہ میں بیٹھ کر میں بہت دیر تک یہ سوچتا رہا کہ قیامت کے دن کی حسرت کیسی ہوگی۔ اس وقت میرے دل سے یہ دعا نکلی کہ پروردگار روزِ قیامت حسرت کی اس روسیاہی سے مجھے محفوظ فرما۔ تو نے اگر یہ دیکھ لیا ہے کہ قیامت کے دن میرے ناقص اعمال کی بنا پر فرشتے مجھے جنت میں جانے سے روک دیں گے تب بھی تو

محض اپنے فضل سے جنت میں بلا استحقاق داخلے کا فیصلہ کر دے۔

Malaysia Truely Asia

نوے کی دہائی کے آخر میں جب میں سعودی عرب میں مقیم تھا، مجھے جگہ جگہ بڑے بڑے بل بورڈ (Billboard) نظر آتے تھے جن میں ملائیشیا میں سیاحتی مقصد سے آنے کی دعوت دی جاتی۔ ان پر نمایاں طور پر یہ سلوگن درج ہوتا تھا۔

Malaysia Truely Asia

یعنی ملائیشیا ہی اصل ایشیا ہے۔ اپنی ترقی کے اعتبار سے ملائیشیا واقعی چینی اقوام کے ہم پلہ نظر آتا ہے۔ مگر سیاحت کے فروغ کے لیے جو نعرہ انھوں نے لگایا ہے اس میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے اہل ملائیشیا نے سیاحوں کے لیے اپنے ملک کو واقعتاً انتہائی پرکشش اور باسہولت بنا دیا ہے۔ اس کا اندازہ ہمیں ملائیشیا میں اپنی اگلی دو منزلوں پر ہوا۔ یعنی جینٹنگ اور لنکاوی۔

جینٹنگ ہائی لینڈ

جینٹنگ ہائی لینڈ (Genting Highlands) کوالالمپور سے 50 کلومیٹر کی مسافت پر واقع ایک خوبصورت اور دلکش پہاڑی مقام ہے۔ اس مقام کی خوبی یہ ہے کہ 2000 میٹر کی بلندی پر ہونے کی وجہ سے یہاں موسم انتہائی خوشگوار رہتا ہے۔ یعنی 20 ڈگری کے قریب۔ موسم خنک ہے، مگر ایسا نہیں کہ برا لگے۔ بارش اکثر ہوتی ہے اور بیشتر وقت یہ علاقہ بادلوں سے ڈھکا رہتا ہے۔ یہاں کے ہوٹلوں میں کمرے کے اندر بادلوں کا آنا معمول کی بات ہے۔ ہمیں بھی اس کا تجربہ ہوا۔ ملائیشیا کے بارشوں سے بھرپور موسم کی بنا پر ہر جگہ درختوں کی بہار اپنا بھرپور رنگ جمائے رہتی ہے۔

قدرت کے اس فطری حسن کو یہاں کی حکومت نے اپنی فراہم کردہ سہولیات سے جب آراستہ کیا تو ملائیشیا اور دنیا بھر سے آنے والوں کے لیے سیاحت اور تفریح کا ایک بہت اعلیٰ مقام وجود

میں آگیا۔ کولالمپور سے جینٹنگ تک کا راستہ بہت ہموار اور کشادہ بنا ہوا ہے۔ بسیں انتہائی صاف ستھری اور آرام دہ جن کا کرایہ بہت کم ہے۔ یہاں دو کیبل کار لوگوں کی تفریح کے لیے ہیں جن میں ’Genting Skyway‘ دنیا کی سب زیادہ تیز رفتار اور جنوب مشرقی ایشیا کی سب سے طویل (3.8 کلومیٹر لمبی) کیبل کار ہے۔ یہ سرسبز جنگلات اور گہرئی کھائیوں سے ہوتی ہوئی کافی نشیب میں واقع قصبے ’Gohtong Jaya‘ تک جاتی ہیں۔ جینٹنگ کی اصل کشش یہاں بنا ہوا تھیم پارک ہے جہاں بچوں اور بڑوں کے لیے متعدد اقسام کے جھولے، رائڈز اور تفریحی چیزیں ہیں۔ ایک دفعہ کرایہ دے کر سارے دن جتنی دفعہ چاہیں ان کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔ البتہ بعض نئے جھولے جن میں لوگوں کی بہت زیادہ دلچسپی ہوتی ہے، ان کا ٹکٹ ہر دفعہ لینا ہوتا ہے۔

یہاں بہت سے اعلیٰ درجے کے ہوٹل ہیں۔ ویک اینڈ اور تعطیلات میں تو یہ بھرے رہتے ہیں، لیکن عام دنوں میں جب رش نہیں ہوتا تو یہ کرائے اتنے کم کر دیتے ہیں کہ وہ لوگ بھی یہاں آ جاتے ہیں جو سیزن میں آنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ یہ ہوٹل بارش اور موسم کے مسائل سے محفوظ راستوں کے ذریعے آپس میں منسلک ہیں۔ یہاں ایک ان ڈور تھیم پارک، کھانے پینے اور خریداری کی بہت سی دکانیں بھی ہیں۔ یہاں ایک کیسینو بھی بنا ہوا ہے جہاں مقامی مسلم ملائیشین لوگوں کے داخلے پر پابندی ہے البتہ دوسرے لوگ وہاں جا سکتے ہیں۔

فطرت کے حسن کے ساتھ انسانی ضروریات، آرام اور تفریح کا خیال رکھتے ہوئے بنائی گئی یہ جگہ سالانہ تقریباً دو کروڑ لوگوں کو اپنے ہاں آنے پر مجبور کرتی ہے۔ یہ جگہ جو ساٹھ کی دہائی تک پہاڑی جنگل کی حیثیت رکھتی تھی ملائیشیا کے ایک چینی ارب پتی سرمایہ دار Lim Goh Tong نے تعمیر کی۔ یہاں بنیادی خیال سے لے کر سرمایہ تک ہر چیز اس کی محنت کا نتیجہ تھی۔ آخر کئی برس کی تعمیر اور محنت کے بعد 1971 میں اس کا افتتاح ہوا اور بتدریج یہ ملائیشیا اور پھر دنیا

کے معروف تفریحی مقامات میں شامل ہو گیا۔

خیال کی یہ بلند پروازی، ان تھک محنت، آگے بڑھنے کا جذبہ، حال میں رہ کر مستقبل کی منصوبہ بندی کر لینا، یہی وہ خصوصیات ہیں جنھوں نے ملائیشیا کو حقیقی ایشیا بنا دیا ہے۔ اور رہے ہم تو ہماری کیا بات ہے۔ دنیا کے عظیم ترین پہاڑی سلسلے، بلند ترین چوٹیاں، حسین ترین وادیاں، ان میں بہتے حیات آفریں دریا، وسیع و عریض صحرا، طویل اور خوبصورت ساحلی پٹیاں، قدیم ترین تہذیبوں کے آثار، مغلیہ عہد کے شاندار تاریخی مقامات کے حامل ہمارے ملک میں سیاحوں کو راغب کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی جاتی۔ نہ اپنے لوگوں کے لیے ہی کسی تفریحی مقام کو تعمیر کرنے یا قدرت کے عطا کردہ تحفوں کو بہتر بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور جو کچھ سوات کی شکل میں سوئٹزرلینڈ سے بہتر علاقہ تھا، اسے اسلحے اور بارود کے ڈھیر میں برباد کر دیا گیا ہے۔

مچھلیاں لائن نہیں بناتیں

ہم کیا ہیں اور ہماری فکری اور مذہبی قیادت نے قوم کی تربیت کتنی غلط بنیادوں پر کر دی ہے، اس کی ایک مناسبت مجھے جینٹنگ تھیم پارک میں نظر آئی۔ میں اپنی اہلیہ کے ہمراہ ڈائناسور کے حوالے سے بنے ہوئے ایک حصے میں جانے کے لے لائن میں کھڑا تھا۔ یہاں مصنوعی پہاڑوں اور غاروں میں ڈائناسور کے زمانے کی منظر کشی کی گئی تھی اور ان کے حوالے سے معلومات بیان کی گئی تھیں۔ اس پورے حصے کا سفر ایک مصنوعی نہر کے ذریعے سے کشتی میں بیٹھ کر کیا جاتا تھا۔ ہم سے آگے قطار میں ایک عرب جوڑا کھڑا تھا جو نہر میں وقفے وقفے سے مچھلیوں کا چارہ پھینکتے تھے۔ یہ چارہ چھوٹے چھوٹے دانوں کی شکل میں تھا۔ جب جب یہ لوگ دانہ پھینکتے رنگ برنگی چھوٹی بڑی مچھلیاں اس جگہ ٹوٹ پڑتیں۔ اس وقت ایک عجیب منظر وجود میں آ جاتا۔

مجھے یہ منظر دیکھ کر احساس ہوا کہ ہم انسانوں نے ایک قطار بنا رکھی ہے اور بہت تحمل سے اپنی

باری کا انتظار کر رہے ہیں۔مگر مچھلیوں میں کوئی قطار نہ تھی۔جس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ جس کا زور چلتا اور جس کا داؤ لگتا وہی مچھلی دانہ نگل لیتی۔مچھلیوں کا ایسا کرنا ان کا کوئی عیب نہ تھا۔ان کی دنیا کا قانون ہی یہی ہے۔مگر انسانوں کی دنیا میں ہر جگہ قطار بنائی جاتی ہے۔قطار عدل و انصاف کی علامت اور اس بات کی یقین دہانی ہے کہ طاقتور اور کمزور، امیر و غریب اور مرد و عورت سب کو یکساں حقوق میسر ہیں۔مگر بدقسمتی سے پاکستان کا معاشرہ پچھلے کئی عشروں سے جس اصول پر تربیت دیا گیا ہے وہ مچھلیوں والا اصول ہے کہ جس کا زور چلتا اور جس کا داؤ لگتا وہی مچھلی دانہ نگل لیتی ہے۔یہاں میرٹ کا چلن عام نہیں۔

ہماری مذہبی اور فکری قیادت اس صورتحال کی اصلاح کے لیے پریشان نہیں۔وہ پریشان ہے تو امریکہ کو نیچا دکھانے کے لیے، افغانستان، فلسطین اور کشمیر سے غیروں کو بے دخل کرنے کے لیے۔یہ لوگ قوم کو اس کام کے لیے اٹھاتے ہیں جسے کرنے کی اُس میں طاقت نہیں اور اگر کر بھی دے تو دوسروں کی تباہی سے زیادہ اپنی تباہی بڑھتی ہے۔اور اس کام کی طرف توجہ نہیں دیتے جو کچھ عرصے کی تربیت کے بعد باآسانی ہوسکتا ہے۔جس کے بعد ہم پر باہر سے کوئی ظلم کر سکے گا اور نہ اندر سے۔

لنکاوی کا جزیرہ

جینٹنگ ہائی لینڈ میں زیادہ تر مقامی لوگ آتے ہیں یا پھر جنوبی اور جنوب مشرقی ایشیا کے لوگ۔اس لیے کہ گرم مرطوب علاقے کے لوگوں کے لیے یہاں کا موسم انتہائی خوشگوار اور یہاں کا تھیم پارک اور کیبل کار کا تجربہ بالکل منفرد ہوتا ہے۔اہل مغرب کے لیے ظاہر ہے کہ ان دونوں چیزوں میں کوئی خاص کشش نہیں۔اس لیے وہ جینٹنگ میں خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ان کی منزل ملائیشیا کے شمال مغربی حصے کے قریب بحرِ اینڈامن (Andaman

Sea) میں واقع لنکاوی کا جزیرہ ہوتا ہے۔

لنکاوی کا جزیرہ بلاشبہ دنیا کے حسین ترین مقامات میں سے ایک ہے۔ایک زمانے میں یہ علاقہ اپنے عقابوں اور ماربل کے لیے مشہور تھا۔اسی مناسبت سے اس کا نام لنکاوی وجود میں آیا جس میں دونوں الفاظ کا مفہوم شامل ہے۔اس کو حسن بخشنے والی اصل شے یہاں کے جنگل ہیں جو لاکھوں برس سے یہاں موجود ہیں۔اصطلاحاً یہ جنگل rainforest کہلاتے ہیں۔یہ اصطلاح ان جنگلوں کے لیے استعمال ہوتی ہے جو بارہ مہینے بارشوں کی زد میں رہتے ہیں۔سارا سال مسلسل بارش صرف انھی علاقوں میں ہوتی ہے جو خط استوا پر واقع ہیں۔ان میں برازیل، وسطی افریقہ اور جنوب مشرقی ایشیا کے علاقے شامل ہیں۔یہ جنگلات زمین کا صرف چھ فیصد حصہ ہیں مگر دنیا کے نصف نباتات و حیوانات ان میں پائے جاتے ہیں۔

لنکاوی کا جزیرہ بھی ایسے ہی جنگلات کا حامل ہے جس کو نامعلوم زمانے سے برسنے والی مسلسل بارشوں نے اتنا گھنا بنا دیا تھا کہ یہاں تک رسائی آسان کام نہ تھی، نہ دنیا کے لیے یہ کوئی اہم مقام تھا۔تاہم اسّی کی دہائی میں ملائیشیا کی حکومت نے اسے ایک سیاحتی مقام بنانے کے لیے یہاں بڑے پیمانے پر ترقیاتی کام شروع کیا۔جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج یہ دنیا اور خاص کر مغربی دنیا کے لیے ایک بہت پرکشش سیاحتی مقام ہے۔

خدائی کی صفات کا ایک دوسرا پہلو

ہمارا ہوٹل عام عمارتوں کی طرح نہیں بنا ہوا تھا بلکہ گھنے جنگل میں کچھ فاصلے پر ہٹ (Hut) بنے ہوئے تھے۔کچھ ہٹ سمندر کے اوپر بھی بنائے گئے تھے مگر وہ بہت مہنگے تھے۔ہمارا قیام گھنے جنگل میں تھا۔ہم شام کے وقت جہاز کے ذریعے سے لنکاوی پہنچے تھے۔ہوٹل پہنچے تو گھنے جنگل میں تن تنہا ایک ایسے ہٹ میں ہم ٹھہرے جس کے اردگرد دور دور تک کوئی اور

آباد نہ تھا۔میری اہلیہ اس تصور سے کچھ وحشت زدہ ہوگئیں کہ یہاں تنہائی میں ٹھہرنا ہوگا۔اس پر مستزاد یہ کہ کمرے میں جاتے ہی ایک گرگٹ نما بڑا جانور نکل آیا۔خیر ہوٹل کا عملہ اسے مار کر لے گیا مگر اس کے بعد میری اہلیہ کی آنکھوں سے نیند اڑ گئی۔پھر اگلی رات اس قدر طوفانی بارش ہوئی کہ کچھ حد نہیں جس سے کئی درخت اور ان کی شاخیں زمین بوس ہوگئیں۔بارش اور بادلوں کی گڑگڑاہٹ، شاخیں اور درخت گرنے کی آواز اور پھر مختلف جانوروں اور حشرات کی آوازوں نے رات کے وقت ایک عجیب سماں قائم کیے رکھا۔

لنکاوی کی خوبصورتی کا احساس ہمیں بعد میں ہوا۔مگر اس سے قبل ہی جن چیزوں سے سابقہ پڑا اس نے طبیعت پر ایک خاص اثر ڈالا۔میں ایسی چیزوں اور معاملات کو خدا کی خلاقیت کا وہ چہرہ کہتا ہوں جس کی تاب کوئی انسان نہیں لاسکتا۔پروردگار بڑا رحیم و کریم ہے۔مگر اس کی طاقت اتنی زیادہ اور انسان اس کے مقابلے میں اتنا کمزور ہے کہ انسان کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ خدا کو ناراض کرکے اپنے لیے عافیت کی کوئی راہ ڈھونڈ سکے۔آج خدا غیب میں رہ کر اپنا تعارف کرا رہا ہے۔کل قیامت کے دن جب وہ سامنے آئے گا تو مجرموں کے لیے وہ دن بدترین دن ہوگا۔قیامت کے دن پروردگار عالم آگ کا ناقابل برداشت عذاب جو ہر طرح کے نباتات اور حیوانات کو جلا ڈالنے کے لیے بہت ہے،صرف سرکشوں،متکبرین اور ظالموں کو دے گا، باقی لوگوں کو وہ اگر تپتے صحراؤں اور وحشت خیز جنگلوں میں بے آسرا بھٹکنے کے لیے چھوڑ دے،تب بھی یہ عذاب ان کے لیے بہت ہے۔

حسنِ فطرت کا شاہکار

بلاشبہ یہ جزیرہ حسن فطرت کا ایک پوشیدہ خزانہ ہے جہاں روزانہ درجنوں ہوائی جہاز ہزاروں لوگوں کو لے کر اترتے ہیں۔اس کے علاوہ اس کی جیٹی پر کشتی کے ذریعے سے بھی

سیاحوں کی بڑی تعداد آتی ہے۔478 مربع کلومیٹر پر پھیلا ہوا یہ چھوٹا سا جزیرہ اپنے اندر وسیع جنگلات اور جنگلی حیات کی ان گنت اقسام لیے ہوئے ہے۔اس کا ساحل انتہائی خوبصورت اور پرسکون ہے۔پورے جزیرے پر ساحلی پٹی کے ساتھ ہر طرح کے ہوٹل بنے ہوئے ہیں۔ہمارا ہوٹل جزیرے کے سب سے آخری سرے پر واقع تھا جس کے بعد پہاڑ آجاتے ہیں۔ان پہاڑوں تک لے جانے کے لیے ایک کیبل کار ہے۔پہاڑ کی چوٹی سے جزیرے کا انتہائی حسین منظر سامنے آتا ہے۔ایک طرف تاحد نظر پھیلا ہوا سمندر ہے اور دوسری طرف سرسبز درختوں سے آراستہ دلکش پہاڑی مناظر۔پہاڑ کی چوٹی سے غروب آفتاب کا نظارہ بے حد متاثر کن ہے۔

مجھے یہاں سب سے بڑی سہولت یہ لگی کہ گاڑی بہت ارزاں نرخ پر کرائے پر مل جاتی ہے اور پورے جزیرے پر عملاً ٹریفک نہ ہونے کے برابر ہے۔روڈ بہت کشادہ اور ہموار ہیں۔راستے بھی پیچیدہ نہیں۔اس لیے ایک نیا آدمی با آسانی ان نقشوں کی مدد سے گاڑی چلاسکتا ہے جو ہر جگہ با آسانی مل جاتے ہیں۔زیادہ تر راستے ساحل کے ساتھ ساتھ یا ساحل پر موجود پہاڑوں پر بنے ہوئے ہیں۔میں اس جزیرے کے ہر حصے پر گاڑی کے ذریعے سے گیا۔تاہم مجھے یہ اندازہ ہوا کہ جہاں میرا ہوٹل واقع تھا وہی علاقہ ہر اعتبار سے سب سے زیادہ بہتر اور دلکش تھا۔اس جزیرے کا مرکزی قصبہ 'Kuah' اس جگہ واقع ہے جہاں جیٹی بنی ہوئی ہے۔اس جیٹی کی نشانی عقاب کا وہ بڑا سا مجسمہ ہے جو ایک پلیٹ فارم پر ایستادہ ہے۔یہیں سے وہ بوٹس ملتی ہیں جو island hopping کے لیے لے جاتی ہیں۔آئی لینڈ ہاپنگ میں ایک تیز رفتار اسپیڈ بوٹ میں بٹھا کر قریب واقع دو تین جزیروں میں لے جایا جاتا ہے۔اس کے علاقہ قریبی جزائر میں عقاب اور دیگر جنگلی حیات کے مشاہدے کے دیکھنے کے لیے بھی بہت سے ٹور ملتے ہیں۔میرے خیال میں جو لوگ زندگی کے ہنگاموں سے دور رہ کر کچھ وقت سکون کے ساتھ فطرت کی نیرنگیوں

میں گزارنا چاہتے ہیں ان کے لیے یہ جگہ بہترین ہے۔ یہاں آکر زندگی اور وقت دونوں کی رفتار تھمی ہوئی سی محسوس ہوتی ہے۔ البتہ ہر لمحہ بدلتے موسم کی آہٹیں شام وسحر کے وجود کا احساس ضرور دلا دیتی ہیں۔

سرِ بازار می رقصم

لنکاوی کا جزیرہ وہ جگہ ہے جہاں فطرت بلا مبالغہ پچھلے کئی کروڑ برسوں سے اپنے رنگ اور اپنے جلوے وقت کی رم جھم کے ساتھ برسا رہی ہے۔ اس بات سے بے پرواہ کہ اس کے حسن کی دید کے لیے کوئی دیدہ ور یہاں آتا بھی ہے یا نہیں۔ حسنِ فطرت کی یہ عجیب ادا ہے کہ وہ اپنے جلوے بکھیرنے کے لیے کبھی عشاق کی محفل کا انتظار نہیں کرتی۔ اسے اپنی بے حجابی کے لیے انسانی دید سے زیادہ سورج کی نگاہِ روشن اور تاروں کی جگمگاتی نظر کا انتظار رہتا ہے۔ اسے رونق سے زیادہ ویرانی اور شہرت سے زیادہ گمنامی پسند ہے۔

حسن بے پروا کو اپنی بے حجابی کے لیے
شہر سے ہوں بن جو پیارے تو شہر اچھے کہ بن

مجھے چار سو پھیلے اس حسن کو دیکھ کر بار بار یہ احساس ہوا کہ یہ حسن تو خودکسی اور حسین کی زلفوں کا اسیر ہے۔ اُس حسنِ ازل کی ایک نظر کے لیے کروڑوں سال سے یہ بیخودی کے عالم میں رقص کیے جا رہا ہے۔ مگر اس قاتل ادا نے ابھی تک پلٹ کر حسن فطرت کو نہیں دیکھا۔ وہ تو کسی اور کے رقص کا منتظر ہے۔ کسی صاحبِ شعور، صاحبِ اختیار، صاحبِ اقتدار کے رقصِ بندگی کا۔ جس کی آنکھوں سے نکلنے والا ایک قطرۂ ناچیز اسے فطرت کی ہزار بارشوں سے زیادہ عزیز ہے۔ جس کی تسبیح وتحمید کا ایک گیت فطرت کے ہزار سُروں سے زیادہ سریلا ہے، جس کی عبدیت کا ایک رنگ فطرت کے ہزار رنگوں سے زیادہ خوشنما ہے۔ جس کی اٹھی ہوئی خدا آشنا نظر ہر پہاڑ کی بلندی

سے بلند تر ہے اور جس کی جھکی ہوئی پیشانی زمین اور سمندر کی ہر وسعت سے زیادہ عریض ہے۔ اس لیے کہ وہ صاحبِ شعور ہو کر رقصِ بندگی کرتا اور صاحبِ جنوں ہو کر حدود آشنائی میں جیتا ہے۔ فطرت کا رقص بہت حسین ہے۔ مگر بندگی کا رقص حسین تر ہے۔ اس لیے کہ یہ ایک بادشاہ کا رقصِ عبدیت ہے۔ یہ رقص ایمان سے شروع ہوتا اور معرفت کی روشنی پا کر اپنے جوبن پر آتا ہے۔ یہ رقص جو دل کی محفل کو آباد کرتا ہے، سانسوں کی مالا میں یادالٰہی کے موتی پروتا، آنسوؤں کی لڑی بنتا اور آخر کار عبد کو معبود سے ہم کلام کر دیتا ہے:

نمی دانم کہ آخر چوں دم دیدار می رقصم
مگر نازم بایں ذوقم کہ پیش یار می رقصم
بیاں جاناں تماشا کن کہ در انبوہ جانبازاں
بصد سامان رسوائی سرِ بازار می رقصم

(مجھے نہیں معلوم کہ میں (اپنے دوست کے) دیدار کے وقت رقص کیوں کرنے لگتا ہوں۔
مگر مجھے اس پر فخر ہے کہ میرا رقص صرف اپنے دوست کے سامنے ہی ہوتا ہے۔
جاناں آؤ اور یہ تماشہ تو دیکھو کہ تمھارے جانبازوں کے گروہ میں اپنی رسوائی کا ہزار سامان
کیے میں سر بازار رقص کر رہا ہوں۔)

انگریز خاتون اور ملائیشیا میں فروغِ اسلام

لنکاوی میں قیام کے دوران میں ایک روز ہم ’’Seven Wells‘‘ گئے۔ یہ پہاڑی ندی سی تھی جہاں پہاڑوں سے آنے والا پانی سات چھوٹے چھوٹے تالابوں کی شکل میں جمع ہوتا اور پھر ایک آبشار کی شکل میں بلندی سے نیچے گرتا ہے۔ اسے دیکھنے کے لیے کافی بلندی پر سیڑھیاں چل کر جانا پڑتا ہے۔ یہ راستہ ایک جنگل سے گزرتا ہے اور اس وقت وہاں بالکل سناٹا تھا۔ ہم جیسے

ہی وہاں پہنچے انتہائی تیز بارش شروع ہوگئی۔مقامی انتظامیہ نے وہاں ایسے ہی حالات کے لیے چند جگہیں بنا رکھی تھیں جن پر چھت ڈلی ہوئی تھی۔ہم نے جس جگہ پناہ لی وہاں ایک انگیز خاتون بھی موجود تھیں۔کچھ دیر میں ان سے گفتگو کا آغاز ہوگیا جو کافی دیر تک جاری رہا۔

ان کا تعلق لندن سے تھا اور یہ ملائیشیا میں بغرضِ ملازمت مقیم تھیں۔ یہ ایک برطانوی یونیورسٹی سے وابستہ تھیں اور داخلے کے خواہشمند، اس خطے کے طلبا کا انٹرویو کرتی تھیں۔اسی مقصد کے لیے یہ پاکستان بھی آچکی تھیں۔ایسی ملاقاتوں میں میرا مقصد ہمیشہ ایک ہی ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ غیر محسوس طریقے پر اسلام کا تعارف لوگوں تک پہنچاؤں۔اس لیے کافی دیر مقامی، مغربی اور پاکستانی حالات پر گفتگو کرنے کے بعد میں انھیں مذہب کے موضوع پر لے آیا۔

وہ خاندانی اعتبار سے کیتھولک تھیں۔مگر مغرب کے عام پڑھے لکھے افراد کی طرح مذہب سے بالکل غیر متعلق۔بس خدا کا نام سن رکھا تھا۔اسلام کا تعارف بس دہشت گردی کے حوالے ہی سے تھا۔زیادہ دلچسپی بدھ مت سے تھی جس کا ظاہری دھوم دھڑ کا (اس کی کچھ جھلکیاں بینکاک میں دیکھیں اور اس سے قبل سری لنکا کے سفر میں میں دیکھ چکا تھا) انھیں بہت پسند تھا۔انھیں مذہبی لوگوں کے اس تصور سے سخت وحشت تھی (اور ہر معقول آدمی کو ہوتی ہے) کہ تمام انسان جہنم میں جائیں گے سوائے اپنے لوگوں کے۔ مجھے یہی دروازہ نظر آیا جس کے ذریعے سے اسلام کی تعلیمات کا تعارف ان تک کرایا جاسکتا تھا۔ میں نے اس حوالے سے ان کے سامنے قرآن کی آیت رکھ دی جس میں نجات کا پیمانہ کسی خاص گروہ سے وابستگی نہیں بلکہ توحید اور آخرت پر ایمان اور عمل صالح کو قرار دیا گیا تھا۔ پھر اسلام سے متعلق کچھ اور چیزیں بھی ان کے سامنے رکھ دیں۔اس طرح کی ابتدائی گفتگو میں صرف اسلام کا مختصر تعارف ہی کرایا جاسکتا ہے جو میں نے کرانے کی کوشش کی اور میری باتیں انہوں نے توجہ سے سنیں۔

دو گھنٹے بعد بارش ختم ہوئی تو وہ رخصت ہوگئیں۔مگر اپنے پیچھے یہ سوال چھوڑ گئیں کہ آخر کب مسلمان اپنی دعوتی غفلت سے بیدار ہوکر توحید و آخرت پر مبنی لائی ہوئی خاتم النبیین کی دعوت انسانیت کے سامنے پیش کریں گے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ جب تک مسلمان یہ نہیں کریں گے اسی طرح غیر مسلموں سے پٹتے رہیں گے۔ملائیشیا وہ جگہ ہے جو اسلام کی دعوتی قوت کا زندہ ثبوت ہے اور جہاں مسلمان تاجروں نے بغیر جنگ و فتح کے اس علاقے کو مفتوح کیا تھا۔

ملائیشیا سے رخصتی

ملائیشیا میں ہم دس دن رہے جن میں سے آخری چار دن لنکاوی میں ایسے گزرے کہ وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔اور آخر کار وہ وقت آیا کہ ہم کوالالمپور کے انتہائی جدید اور شاندار ائیر پورٹ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ ہر اعتبار سے ایک ترقی یافتہ ملک کا ائیر پورٹ لگ رہا تھا۔ مجھے اس بات کی بہت خوشی تھی کہ ملائیشیا نے ایک مسلم ملک ہوتے ہوئے اتنی ترقی کرلی۔ حالانکہ یہ وہ خطہ ہے جہاں مقامی ملائی نسل کے مسلمانوں کے علاوہ جن کا آبادی میں تناسب 58 فیصد ہے، چینی اور انڈین بھی موجود ہیں جن کا تناسب بالترتیب 24 اور 8 فیصد ہے۔باقی دس فیصد دیگر لوگ ہیں۔

چینی نسل کے لوگ زیادہ دولتمند اور خوشحال ہیں اور ان میں اور مقامی مسلمانوں میں کچھ اختلافات بھی ہیں تاہم اس کے باوجود اس ملک نے غیر معمولی ترقی کی ہے۔اس کا اندازہ بلند و بالا تعمیرات سے بھی ہوتا ہے اور اس کوالالمپور کی مونوٹرین میں بیٹھ کر بھی جو بلند ستونوں پر بنے فضائی ٹریک پر جب چلتی ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ ہم ہوا میں اڑ رہے ہیں۔ان کی یہ ترقی عالمِ اسلام کے لیے ایک لائقِ تقلید چیز ہے۔اس لیے کہ ان کی اس ترقی کے باوجود انھوں نے اپنے مذہب، تہذیب اور روایات سے رشتہ نہیں توڑا۔جن بعض اخلاقی مفاسد کا پیچھے میں نے ذکر کیا ہے، میرا خیال ہے، اس کا ایک سبب یہاں غیر مسلموں اور چینی تہذیب

کے لوگوں کا بہت بڑی تعداد میں ہونا ہے۔

میں ائیر پورٹ کے لاؤنج میں بیٹھا یہ سوچ رہا تھا کہ کبھی وہ وقت بھی آئے گا جب ہمارا ملک ترقی کے اس سفر کا آغاز کر سکے گا؟ میرے دل نے جواب دیا وہ وقت ضرور آئے گا۔ لیکن اس سے قبل ہمارے لوگوں کو اپنی قیادت کو بدلنا ہوگا۔ یا کم از کم اسے یہ بتانا ہوگا کہ اب کسی مفاد پرست شخص کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ لوگوں کو زیادہ عرصے تک بیوقوف بنا سکے۔

عظیم امکان اور ہماری کوتاہی

ہمارے سفر کی اگلی منزل تھائی لینڈ کا شہر بینکاک تھا۔ تھائی لینڈ کا ملک فطری حسن سے مالا مال ہے۔ تھائی لینڈ کی آمدنی کا ایک بڑا انحصار سیاحت کے ذریعے کمایا جانے والا پیسہ ہے۔ سیاحت یہاں کتنی زیادہ اہم ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ تھائی لینڈ کی کل آبادی چھ کروڑ سے کچھ اوپر ہے جبکہ یہاں آنے والے سیاحوں کی تعداد 2007 میں آٹھ کروڑ سے اوپر تھی۔ جبکہ سیاحت کے شعبہ سے ہونے والی آمدنی سولہ ارب ڈالر ہے۔ جو کہ اس کی اہم ترین برآمدات یعنی کمپیوٹر، گارمنٹ وغیرہ کی مجموعی آمدنی سے بھی زیادہ ہے۔

معاملہ صرف تھائی لینڈ کا نہیں بلکہ سنگاپور اور ملائیشیا کا بھی یہی معاملہ ہے۔ سنگاپور کی آبادی 50 لاکھ سے بھی کم ہے، مگر 2007 میں آنے والے سیاحوں کی کل تعداد 97 لاکھ اور اس شعبے سے ہونے والی آمدنی 13.8 بلین ڈالر رہی۔ جبکہ ملائیشیا کی آبادی دو کروڑ چالیس لاکھ ہے اور سن 2007 میں آنے والے سیاحوں کی تعداد دو کروڑ دس لاکھ رہی اور ان سے ہونے والی آمدنی 15 بلین رہی۔

ان اعداد وشمار کو دیکھیے اور پاکستان کی ان خصوصیات کو ذرا ذہن میں رکھیے جن کا تذکرہ میں پیچھے کر چکا ہوں۔ پاکستان بلا مبالغہ سالانہ کروڑوں سیاحوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی

صلاحیت رکھتا ہے، جس سے اربوں ڈالر کی سالانہ آمدنی ہو سکتی ہے۔ مگر ہم اپنی کوتاہیوں کی وجہ سے اس امکان سے فائدہ نہیں اٹھا پاتے۔

ریڈ لائٹ سٹی

بینکاک ایک کڑور کی آبادی کا شہر ہے۔ یہ سیاحوں کے لیے دنیا کے مقبول ترین شہروں میں سے ایک ہے۔ اس کا ایک سبب تھائی لینڈ کے قدرتی حسن کے علاوہ یہ ہے کہ بینکاک شاپنگ کا ایک بہت بڑا عالمی مرکز ہے۔ یہاں بڑے بڑے اور خوبصورت شاپنگ سینٹرز ہیں جن میں دنیا بھر کی چیزیں کثرت سے ملتی ہیں۔ مگر بد قسمتی سے اس ملک کی اصل وجہ شہرت کچھ اور ہے۔ تھائی لینڈ قحبہ گری کے لیے ایک بدنام ملک ہے اور بہت سے سیاح صرف اسی مقصد کے لیے اس ملک میں آتے ہیں۔

قحبہ گری دنیا بھر میں عام ہے۔ عالم اسلام کے ممالک بشمول پاکستان کا بھی اس میں کوئی استثنا نہیں۔ ملائیشیا میں دو کال گرل کے سرِ راہ نظر آنے کا قصہ میں پیچھے بیان کر چکا ہوں۔ سنگاپور میں ایک پورا علاقہ ریڈ لائٹ ایریا کے طور پر وقف ہے۔ مگر بد قسمتی سے بینکاک کا پورا شہر ریڈ لائٹ سٹی ہے اور یہ اعزاز دنیا کے کم ہی شہروں کو حاصل ہوگا۔ یہ بات اس پس منظر میں بڑی عجیب لگے گی کہ تھائی لینڈ میں سرکاری طور پر قحبہ گری پر پابندی ہے۔ تاہم عملاً اس پابندی کا کوئی وجود نہیں۔ حکام جان بوجھ کر اس دھندے سے آنکھیں بند کیے رکھتے ہیں۔ غالباً انہیں خود بھی احساس ہے کہ زرمبادلہ کمانے کا یہ سب سے آسان طریقہ ہے۔ اس پیشے کے فروغ کا سبب بھی تھائی لینڈ کی غربت ہے، غریب طبقے کی دیہاتی لڑکیوں کے لیے پیسہ کمانے کا یہ سب سے آسان طریقہ ہے۔

ہوٹل اور مختلف جگہوں پر ملنے والے بروشرز سے اندازہ ہوا کہ انفرادی طور پر اور اداروں کی شکل

میں یہ بیماری ہر ممکنہ طریقے سے یہاں پھیلی ہوئی ہے۔ نائٹ کلب، شراب خانے اور خاص کر مساج سینٹر میں دراصل یہی کام ہو رہا ہوتا ہے۔ شاید انسانی فطرت میں بدکاری کے خلاف جو ایک فطری رکاوٹ ہے، اسے توڑنے کے لیے یہ ذرائع اختیار کیے گئے ہیں۔ مذہبی لوگ سدِ ذریعہ کے اصول پر ہر اس چیز سے روکتے ہیں جو برائی کے قریب لے جانے کا سبب بنے اور یہاں ہر وہ ممکن ذریعہ اختیار کیا جاتا ہے جس کے ذریعے سے لوگ اس برائی کے قریب آسکیں۔ ملائیشیا کے ذکر میں لکھ چکا ہوں کہ سیاحوں کے پیروں میں پیدل چل کر درد ہو جاتا ہے۔ اس لیے وہاں قدموں کے مساج کرنے والے ہر جگہ نظر آئے۔ لیکن پیروں کا یہ مساج جسم کا مساج کرانے کی خواہش تک پہنچتا ہے اور یہاں سے بدکاری کی منزل فاصلوں کی مسافت پر نہیں بلکہ خواہش کے چند کمزور لمحوں کی مسافت پر رہ جاتی ہے۔ وہ کمزور لمحے جو انسان کو ابدی ذلت اور رسوائی میں مبتلا کر سکتے ہیں۔

مجھے سب سے زیادہ دکھ ان لڑکیوں کو دیکھ کر ہوا جو اپنا گریبان چاک کیے دوسرے کا دامن چاک کرنے کے ارادے سے سرِ راہ کھڑی ہوئی نظر آئی۔ میں نے ان کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ اس پر کسی خوشی، سکون اور اطمینانیت کا نشان تک نہیں تھا۔ بارہا ایسی لڑکیاں غیر ملکی سیاحوں کے ساتھ جاتی ہوئی نظر آئیں اور یہ حسنِ ظن رکھنے کی کوئی وجہ نہیں کہ وہ ان کی بیویاں تھیں۔ کئی جگہ راستے میں ایجنٹ تصاویر کے البم لیے سیاحوں کو روکتے ہوئے نظر آئے۔ ان ساری چیزوں کی وجہ سے بینکاک میں میرا دل بجھا بجھا سا رہا۔ جوان لڑکیوں کو سرِ بازار یوں بکنے کے لیے کھڑا دیکھ کر مجھ پر تأسف کی غیر معمولی کیفیت طاری ہوئی۔ مجھے محسوس ہوا کہ میری اولاد کو بازار میں لا کر اس طرح کھڑا کر دیا گیا ہے۔ میں سوائے اللہ تعالیٰ سے دعا کے اور کچھ بھی نہیں کر سکا۔

زنا اور ایمان

کہا جاتا ہے کہ زنا اور بدکاری دنیا میں اتنے ہی قدیم ہیں جتنا انسان، مگر دورِ جدید میں

بدکاری اور عریانی کا چلن اتنا عام ہو گیا ہے کہ تاریخ میں جس کی مثال نہیں ملتی۔ میرے نزدیک یہ ایمان کی بنیاد پر قائم تہذیب کی شکست کا براہ راست نتیجہ ہے۔ دراصل سیدنا ابرہیم کے زمانے یعنی پچھلے چار ہزار برسوں سے دنیا پر وہ اقدار حکمران تھیں جو اہل کتاب نے قائم کی تھیں۔ ان اقدار میں زنا کو کسی اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ مگر ایمان اور مذہب کے خاتمے کے بعد اب زنا کو بری نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔

آج عریانی کو ایک تہذیبی قدر اور زنا کو آزادی کا فطری نتیجہ سمجھا جاتا ہے۔ آزادی کے متوالے انسان سب سے پہلے جنسی آزادی چاہتے ہیں۔ سود پر مبنی جدید معیشت جس میں ہر چیز فروختنی ہے، عورتوں کی سب سے بڑی خریدار ہے۔ دوسری طرف اقدار کی موت کے بعد عورتیں بھی جان چکی ہیں کہ ان کا سب سے بڑا اثاثہ ان کا جسم ہے اور جس کی نقد قیمت جب چاہیں جہاں چاہیں وہ وصول کر سکتی ہیں۔ چنانچہ بدکاری کی راہ ہموار ہو جاتی ہے۔ مگر چونکہ یہ فطرت کے قانون کی خلاف ورزی ہے اس لیے انسانیت اس کی سزا کبھی Sexually Transmitted Dieseases اور ایڈز کی شکل میں بھگتی ہے اور کبھی خاندانی نظام کے ٹوٹنے، ناجائز بچوں اور سنگل پیرنٹ فیملی جیسے مسائل کی شکل میں پاتی ہے۔ رہے تھائی لینڈ جیسے غریب ملک تو اس کنزیومر ایج میں جب خواہش پوری کرنا انسانی زندگی کا سب سے بڑا نصب العین ہے، ان کا مقدر یہی ہے کہ ان کی خواتین سر بازار بکیں اور دنیا بھر سے گاہک آ آ کر ان کی بولی لگائیں۔

میرے نزدیک آج کرنے کا اصل کام لوگوں کو زنا چھوڑنے کی دعوت دینا نہیں، دعوتِ ایمان دینا ہے۔ مجھے بینکاک میں گھومتے ہوئے بدھ مت کے ان ماننے والوں کے درمیان بار بار یہ خیال آیا کہ ان لوگوں نے خدا کو کھونے کے بعد گوتم بدھ اور بکھشوؤں کو اپنا معبود بنا لیا۔

مذہب کے نام پر ظاہری دھوم دھڑ کے کا سہارا لیا۔ روحانی سکون کے لیے بت پرستی کو اختیار کرلیا۔مگر ان کے ہر مرض کی اصل دوا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہے۔حضور کو دوبارہ آنا نہیں ہے۔کام تو سارا امتیوں کو کرنا ہے۔مگر امتی کسی آنے والے کے منتظر ہیں جو ان کی طرف سے ساری دنیا سے لڑکر، ان کے دشمنوں کا بھرکس نکال کر اور مسلمانوں کی حکومت قائم کر کے اسلام کا جھنڈا لہرا دے گا۔اس کے بعد مسلمان چین کی بانسری بجاتے رہیں گے۔ یہی کچھ یہودیوں نے سوچا اور اپنی ذمہ داریاں پوری نہ کیں تو اس کی سزا رومی حکومت کے ہاتھوں بھگت لی۔ یہی کچھ مسلمان سوچ رہے ہیں اور اپنے حصے کی سزا بھگت رہے ہیں اور اندیشہ یہ ہے کہ آئندہ آنے والے دنوں میں زیادہ بھگتیں گے۔

لوٹ کر جانا ہے

بینکاک شہر اور اس ملک میں بہت سی جگہیں ہیں جو قابل دید ہیں۔لیکن بینکاک آکر طبیعت میں ایک نوع کا انقباض پیدا ہوگیا۔میری طبیعت ہوٹل سے باہر نکلنے پر آمادہ نہ تھی۔اس لیے میں زیادہ تر اہلیہ کا ساتھ دینے کے لیے باہر گیا۔ یہاں کے شاپنگ سنٹر دیکھے، بدھ مت کی رسومات دیکھیں، بنت حوا کو بکتا دیکھا۔ یہاں کے اس ماحول نے میرے شعور کی اس آنکھ پر شدید اثر ڈالا تھا جو دوران سفر بیدار ہو جاتی تھی۔خدا کی دنیا بلا شبہ بہت حسین ہے،مگر اس دنیا کے اندر انسانوں نے اپنی جو دنیا تخلیق کی ہے اس میں مادیت، حیوانیت، شرک اور خدا فراموشی نے مل کر وہ آلودگی پیدا کر دی ہے جس میں کسی خدا پرست کے لیے سانس لینا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔مگر بینکاک کیا یہ تو اب عالمی کلچر بنتا جا رہا ہے۔لیکن یہ کوئی سادہ معاملہ نہیں۔ یہ اس چیز کا اعلان ہے کہ خدا نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے توحید اور انسانیت پر مبنی جو عالمی انقلاب برپا کیا تھا وہ ختم ہو رہا ہے۔ اس لیے اب وہ وقت آ رہا ہے کہ دنیا کو ختم کر دیا جائے۔ اس زمین کا انتظام

انسانوں کے ہاتھوں سے لے کر فرشتوں کو دے دیا جائے۔

یہ ہونے جا رہا ہے۔ یہ ہونا شروع ہو گیا ہے۔ البتہ اس روز عدل کے آنے سے پہلے خدا اپنے عدل کے تقاضوں کے تحت انسانیت کو آخری دفعہ اپنا پیغام پہنچانا چاہتا ہے۔مسلمانوں نے یہ کام نہیں کیا۔ وہ قومی لڑائیوں میں لگ گئے۔لیکن خدا ان کا محتاج نہیں۔ اس نے انفارمیشن ایج کا آغاز کر دیا۔ فاصلوں کو سمیٹ دیا۔علم کی تجدید کر دی۔ دینِ خالص کو واضح کر دیا۔ اس کے ابلاغ کے ذرائع جنم دے دیے۔ اپنا کام کرنے والے پیدا کر دیے۔آج فیصلہ کن ابلاغ کا کام شروع ہو گیا ہے۔ خدا کا تعارف عام ہو رہا ہے۔ اس سے ملاقات کی تنبیہ کی جا رہی ہے۔ اس کے رسول اور آخرت کی حجت پوری کی جا رہی ہے۔جس روز یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچے گا اسرافیل اللہ اکبر کہہ کر صور پھونکیں گے۔زلزلۂ قیامت برپا کر دیا جائے گا۔سمندر ابل پڑیں گے۔آسمان پھٹ جائے گا۔ستارے بکھیر دیے جائیں گے۔سورج تاریک ہو جائے گا۔ پہاڑ کوٹ کوٹ کر برابر کر دیے جائیں گے۔شہر برباد ہو جائیں گے۔ بستیاں ویران ہو جائیں گی۔ انسانیت پر موت طاری ہو جائے گی۔زندگی ختم ہو جائے گی......زندگی ختم ہو جائے گی۔

پھر صور پھونکا جائے گا۔زندگی شروع ہو جائے گی۔ زمین کو دلہن کی طرح سجایا جائے گا۔جہنم کو دہکایا جائے گا۔شعلوں کو بھڑکایا جائے گا۔انسانوں کو جمع کیا جائے گا۔حشر کا دربار سجا دیا جائے گا۔ میزان عدل نصب کیا جائے گا۔حساب کتاب شروع ہوگا۔فرد فرد کو بلایا جائے گا۔ لمحے لمحے کا حساب ہوگا۔حکمرانوں کی پکڑ ہوگی۔ دولتمندوں کا حساب ہوگا۔متکبروں کو گھسیٹ کر ذلیل کیا جائے گا۔ سرکشوں کو جہنم رسید کیا جائے گا۔مفسدوں اور غافلوں کو ان کے انجام تک پہنچایا جائے گا۔عمل کرنے والوں کو عمل کا بدلہ دیا جائے گا۔صبر کرنے والوں کو صبر کا بدلہ دیا جائے گا۔خدا والوں کو خدا کا قرب دیا جائے گا۔ابدی بادشاہی شروع ہوگی۔ جنت کے محل آباد ہوں گے۔حوروں کے خیمے شاداب ہوں

گے۔ جنت کے بازاروں میں رونق ہوگی۔فردوس کی بستی رنگ ونور کی بارش میں ڈوب جائے گی۔ اندھیرے ختم ہوجائیں گے۔ روشنی پھیل جائے گی۔خواب ختم ہوجائیں گے۔تعبیر سامنے آجائے گی۔زندگی سامنے آجائے گی۔زندگی شروع ہوجائے گی......زندگی شروع ہوجائے گی۔

بینکاک میں میں چاردن مردہ دلی کے عالم میں رہا۔خواب دیکھتا رہا۔اس لیے کہ خواب زندگی کی علامت ہے۔انھی خوابوں کے ساتھ بینکاک سے زندگی کی امید لیے واپس اپنے ملک کی طرف روانہ ہوا۔اس امید پر کہ کبھی اپنے حقیقی وطن کی طرف بھی زندگی کی امید پر لوٹ کر جانا ہوگا۔

[ختم شد]